مولانا ارشد جمال اشرفی

شعری مجموعہ

واردات

الاسلام مشن بنارس

مولانا ارشد جمال اشرفی

شعری مجموعہ

واردات

الاسلام مشن بنارس

VARIDAT

by

Maulana Arshad jamal Ashrafi
D.43/107,Bazar Sadanand.
Varanasi.U.P.India.221001
email:aimvns@gmail.com

First Published: November - 2005

Al-Islam Mission
Varanasi.U.P.India.

انتساب

اپنے تیسرے جدِامجد
جناب جان محمد (مَہتُو) مرحوم
کے نام
جو اپنی قوم کے ثالث تھے۔
حجِ بیت اللہ کو جاتے ہوئے
اُنھوں نے اپنا یہ منصب ایک دوسرے معزز شہری کو سونپ دیا تھا۔
پھر وہیں کعبے کی سرزمین پر اُن کا انتقال ہو گیا۔

واردات میں

وارِدات سے پہلے

مجھے شاعر نہیں ہونا تھا، کیونکہ میرا علمی ،ادبی اور تبلیغی سفر اُس کے بغیر بھی جاری تھا۔مگر میں اپنی فطرت اور قلبی واردات کے مسلسل اصرار سے شعر گوئی پر مجبور ہوگیا۔ابھی میں چودہ برس کا ہی تھا کہ مجھے یہ مجبوری پیش آ گئی تھی۔میرا اپنا ایک راگ تھا جسے میں 'ٹوٹ پھوٹ' کے موسم میں گاتا تھا۔ یہ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ ''راگ'' ہی نہیں ''شعر'' بھی ہے۔ورنہ مجھے کیا پتہ کہ شاعری کیا چیز ہے؟ کسی استاذ نے بھی نہیں بتایا تھا کہ'' فاعلاتن فاعلن'' کس بلا کا نام ہے؟ آج میں سولہ سترہ برسوں سے اپنا وہی راگ اَلاپ رہا ہوں۔ چونکہ میں نے فن سیکھ کر شعر بنانے کا کام نہیں کیا ہے، اِس لئے مجھے اِس بحث سے غرض نہیں کہ میرا فن کہاں تک کامیاب ہے؟ یہ میرا اپنا راگ ہے، اپنی دُھن میں گاتا ہوں: کبھی آپ بیتی کو جگ بیتی بنا کر اور کبھی جگ بیتی کو آپ بیتی بنا کر۔

میرے لاشعور سے جب یہ چشمہ پھوٹا تھا، تب میرا شعور پختہ نہیں تھا۔بس اتنا یاد ہے کہ طالب علمی کا دور میرے لئے بڑا ہی حادثاتی دور تھا۔کتابوں سے زیادہ چہرے اور مناظر میری دلکشی کے باعث تھے۔ پڑھنے سے زیادہ ''سوچنا'' میرا مشغلہ تھا۔میں ''کیوں'' اور ''کیسے'' کا قائل تھا۔آنکھ بند کر کے مان لینے کی سعادت سے میں شروع ہی سے محروم رہا ہوں۔ مجھے بھی تقلید و روایت کی بیڑیاں پہنانے کی کوششیں کی گئیں، جبر کے پہاڑ بھی توڑے گئے، پھر بھی میں بھیڑ بکریوں کے اُس ریوڑ میں شامل نہ ہوسکا، جسے چرواہے نے کسی ایک طرف ہانک دیا ہو۔میں آج بھی اُنہی حالات سے نبرد آزما ہوں۔

میری شعر گوئی میرے لئے سب سے زیادہ اذیت ناک مرحلہ ہے۔میں نے بارہا کوشش کی کہ مجھے اِس اذیت سے چھٹکارا مل جائے ،لیکن مجھے ہر بار منہ کی کھانی پڑی، کیونکہ میری شاعری کسی نظریے یا ماحول کی پیداوار نہیں، بلکہ یہ کربِ ذات، کشمکش حیات اور عبرت انگیز واردات کی ایک ایسی بے اختیار آواز ہے جس میں کبھی نغمہ و تبسم بھی ہوتا ہے، کبھی درد و کراہ بھی اور کبھی چیخ و پکار بھی۔شاید میں اُسے ردیف و قافیہ کی زنجیر میں جکڑ کر اُس پر بے پناہ ظلم کرتا ہوں۔ چند شعر کہہ لینے کے بعد میرا دکھ بڑھ جاتا ہے کہ ماضی و حال کے تلخ تجربات و مشاہدات کی ایک لمبی فہرست ہے جسے میں نے نظر انداز کر دیا اور جو کچھ کہا بھی تو ادھورا۔ ذرا سی لفظیات میں بھلا میں اُن تاثرات کو کیسے بیان کروں جو پسِ واردات میرے اعضا پر، میرے دل و ماغ پر اور میرے حواس پر مرتب ہوتے رہے ہیں؟ یہاں میں بھی عاجز ہوں اور میری شاعری بھی،لھٰذا یہ معاملہ میں آپ کے فہم و شعور کو سپرد کئے دیتا ہوں۔

میں ''واردات'' کی اشاعت کے موقع پر اُن تمام اکابر و احباب کا بے حد ممنون ہوں جنھوں نے مجھے اپنے مفید اور قیمتی مشوروں سے نوازا ہے۔

ارشد جمال اشرفی

ارشد جمال اشرفی اور اُن کی شاعری

پروفیسر حفیظ بنارسی
سابق پروفیسر یونیورسٹی و صدر شعبۂ انگریزی
مہاراجہ کالج، ویر کنور سنگھ یونیورسٹی، آرہ، بہار

تمام فنون لطیفہ میں شاعری کو مقامِ اولیت، افضلیت و اشرفیت حاصل ہے۔اس کا سبب یہ ہے کہ ایک شاعر چند لفظوں میں خیالات و جذبات کی جو عکاسی کر دیتا ہے وہ افسانہ نگار اور ڈرامہ نویس کے بس کی بات نہیں۔اسی طرح غزل کو بھی تمام اصناف سخن میں طرۂ امتیاز حاصل ہے کہ محض دو مصرعوں میں ایک غزل گو شاعر بڑی سے بڑی بات کہنے پر قادر ہے۔غالب نے جب یہ کہا:

سب کہاں کچھ لالۂ و گل میں نمایاں ہوگئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں

تو ایک بہت بڑا فلسفہ، ایک عظیم حقیقت صرف دو مصرعوں میں سمٹ گئی۔

ایک زمانہ سے غزل کہی جارہی ہے اور آج بھی اُس کی زلفیں سنوارنے والے پورے انہاک سے یہ کام انجام دے رہے ہیں۔غزل پر ایک ایسا وقت بھی پڑا جب اُس کو گردن زدنی تصور کیا جانے لگا۔خود رئیس المتغزلین حضرت جگر مرادآبادی نے کہا ع

شاعر نہیں ہے وہ جو غزل خواں ہے آج کل

مگر غزل کی سخت جانی دیکھئے کہ آج بھی تمام حلقوں میں ہر دلعزیز اور حد درجہ مقبول اور پسندیدہ ہے۔

بظاہر غزل کہنا بہت آسان نظر آتا ہے مگر خصوصیاتِ غزل کے ساتھ غزل کہنا بہت دشوار ہے۔غزل کہنے والوں کا ایک بڑا مجمع ہے مگر چند ہی ہیں جو اِس میدان میں کامیاب و کامران ہیں۔ زیر نظر مجموعہ مولانا ارشد جمال اشرفی صاحب کی تصنیف ہے جو درس و

تدریس کے مقدّس پیشہ سے وابستہ ہیں۔ اُن کا وطنِ عزیز بنارس ہے جو بڑی مردم خیز جگہ ہے اور جہاں ایک سے ایک شاعر اور ادیب پیدا ہوئے اور بڑی شہرت و عزت حاصل کی۔ ارشد جمال اشرفی ہیں تو مولوی مگر اُن کے سینے میں ایک اچھے شاعر کا دل دھڑک رہا ہے۔ میں نے اُن کے کلام کو بڑی دلچسپی سے پڑھا اور مجھے کئی اشعار ایسے ملے جنھیں دوبارہ وسہ بارہ بھی پڑھنا پڑا۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ شاعر کا کلام خود اُس کا تعارف ہوتا ہے۔ ذیل میں اُن کے کچھ اشعار نقل کر رہا ہوں جن سے میں بہت زیادہ متأثر ہوا، آپ بھی پڑھیے اور لطف اندوز ہوییے۔ ہر شخص کی پسند الگ الگ ہوتی ہے، اس لئے یہ کہنا پڑتا ہے کہ ع

شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

یہ سب کیا ہے زمیں سے آسماں تک
کوئی سمجھے تو سمجھے بھی کہاں تک

☆☆☆

جمالِ زندگی مہمانِ دنیا
بہاروں کی ہنسی دورِ خزاں تک

☆☆☆

ایسے جلوے کس لئے تابِ نظر سے پیشتر
اتنے پردے کس لئے ہیں جلوہ آرائی کے بعد

☆☆☆

تم نے بھی بند کر لئے دل کے تمام در
میں بھی تمھارا درد ذرا بھولنے لگا

☆☆☆

کہیں دریا کی خاموشی سے تم دھوکا نہ کھا جانا
سنا ہے تیرنے والے کنارے ڈوب جاتے ہیں

کچھ نہ کچھ ہنگامہ آرائی کیئے جاؤ ضرور
خالی خالی سونی زندگی اچھی نہیں

☆☆☆

چھوٹے سے گھر میں تھیں ہمیں آزادیاں نصیب
آ کر کشادہ محلوں میں محصور ہو گئے

☆☆☆

اس کی آنکھیں تجوری کو تکتی رہیں
چین سے سو گئی مفلسی رات میں

☆☆☆

اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کی دے توفیق رب!
ہم اَنا والے ہیں ہم سے نوکری ہوتی نہیں

☆☆☆

چہرے مہرے سب اِک جیسے اور لب و لہجہ یکساں
کس سے تم پرہیز کرو گے اور کسے اپناؤ گے

☆☆☆

وقت نے چھین لیا سارا اثاثہ میرا
اک اَنا ہے جسے مشکل سے بچا رکھا ہے

☆☆☆

وہ کسی غریب کی بھول تھی جو سڑک پہ ننگی کھڑی رہی
یہ امیر زادے کا جرم ہے، کئی عزتوں میں چھپا ہوا

☆☆☆

غمِ حیات کے ساتھ اُس کی بے وفائی بھی
مرے خدا مری جاں پر عذاب کتنا ہے

ہم ایسے تیز رَو نہ تھے صحرائے زیست میں
جب تک ہمارے پاؤں میں کانٹا چبھا نہ تھا

☆☆☆

کس کی یادوں کا سنسان جنگل ہے یہ، کارواں تھک گیا سوچتے سوچتے
زخم کے سیکڑوں خیمے گڑنے لگے ، درد کی آگ بھی پاس جلنے لگی

☆☆☆

آدم کا خاندان کہاں جاکے بس گیا
میں نے بہت تلاش کیا آدمی کا گھر

☆☆☆

اک بوند چکھ کے چاک گریباں وہ ہوگیا
کم ظرف کو شراب پلائی نہ جائے گی

☆☆☆

گولیاں بارود اِن بچوں کو دو
ہم کھلونوں سے اِنھیں بہلا چکے

☆☆☆

اب اُس بے وفا سے شکایت بھی کیسی
ہم اپنے کیئے کی سزا پا رہے ہیں

☆☆☆

بزرگوں نے غریبوں کے لہو سے اِس کو سینچا تھا
یہی وہ پیڑ ہے ارشدؔ پہ جو سایہ نہیں کرتا

☆☆☆

ذرے ذرے میں جلوہ اُسی ایک کا
میں نے دیکھا مگر کچھ بھی دیکھا نہ تھا

یہ لوگ بڑھ کے مجھے تھام بھی تو سکتے تھے
میں گر گیا ہوں تو کہتے ہیں: کیا ہوا بھائی

☆☆☆

مجھ کو اپنی روشنی پر تھا نہایت اعتماد
تم گئے تو میرے اندر گھپ اندھیرا ہوگیا

☆☆☆

تمام شہر نفرتوں کی آگ میں جھلس اٹھا
فقیہِ شہر قتل ہو ، یہ خیر ہے، ثواب ہے

یہ مقامِ مسرت ہے کہ جناب ارشد جمال اشرفی نے بہت کم عمری ہی میں اتنا سارا غزلیہ کلام اکٹھا کرلیا اور آج وہ کتابی شکل میں آپ کے سامنے ہے۔ کتابیں بہت زیادہ چھپ رہی ہیں، کچھ تو گورنمنٹ کی امداد سے اور کچھ شاعر کے احباب اور متعلقین کی نگاہِ کرم سے۔ یہ کام روزافزوں ہے مگر کچھ ہی کتابیں ایسی ہیں جن کو پڑھا جاتا ہے ورنہ زیادہ تر کتابیں ایسی ہوتی ہیں جنھیں باذوق قارئین بھی بھاری پتھر سمجھ کر محض چوم کر چھوڑ دیتے ہیں شکر خداوندی بجالانا چاہئے کہ زیر نظر مجموعہ اِس ضمن میں نہیں آتا۔ یہ غزل کے سرمایہ میں اپنی جگہ آپ بنالے گا، اِس کا مجھے پورا یقین ہے۔ مجھے امید ہے کہ باذوق حلقوں میں اِسے زبردست مقبولیت حاصل ہوگی۔

حفیظ بنارسی

واردات......تازہ ہوا کا ایک جاں بخش جھونکا

تاج الدین اشعر رامنگری

سابق ایڈیٹر روزنامہ قومی مورچہ، بنارس

میرے لئے یہ انتہائی مسرت اور یک گونہ امتیاز کا معاملہ ہے کہ مجھے ''واردات'' جیسے نفیس و معیاری مجموعہ کلام پر اظہار خیال کی دعوت دی گئی ہے۔ اِس صحیفہ سخن کے خالق مولانا ارشد جمال اشرفی صاحب سے میری براہِ راست کوئی دید وشنید نہیں۔ ایک دینی تقریب میں اُن کی ایک تقریر سنی تھی، بات چیت کا موقع اُس وقت بھی نہیں ملا تھا۔ میرے محبّ مکرم مولانا نصیر احمد سراجی نے مجھے کتاب ''واردات'' دے کر تاکید کی تھی کہ اِس پر آپ کو تبصرہ لکھنا ہے۔ کتاب کا مطالعہ کر کے مجھے حیرت آمیز خوشی محسوس ہوئی تھی۔ یہ کسی ایسے شاعر کا کلام ہرگز نہیں معلوم ہوتا تھا جس کی مشقِ سخن کی عمر ۱۵ برس سے زیادہ نہ ہو اور جس کے حصول تعلیم کے ماہ وسال ایک عربی مدرسہ میں صرف ونحو، تفسیر وحدیث اور فقہ کے پیچیدہ مسائل سمجھنے میں گزرے ہوں اور جس کی وضع وقطع بھی خالص مولویانہ ہو۔ مدرسہ کے ماحول میں اور ایک روشن خیال، آزاد فکر و بے باک شاعر کے مزاج میں ہمیشہ سے ایک دوری رہی ہے۔ مدرسہ میں نشو ونما پانے والا کوئی شخص اگر شاعر بن بھی گیا تو یہی سمجھا جاتا ہے کہ اس کی حد پرواز نعت، حمد، منقبت اور دوسرے مسلک والوں پر لعنت وتکفیر کی کیچڑ اچھالنے سے اوپر نہیں ہوسکتی۔ یہی وجہ ہے کہ فارسی کے کسی پرانے شاعر کو جب معلوم ہوا کہ اس کے کلام پر اہل مدرسہ من مانا ردّ وقدح کررہے ہیں تو اُس کی زبان سے بے ساختہ یہ جملہ نکلا کہ ''شعر مرا بمدرسہ کہ برد'' (آخر میرے اشعار کو مدرسہ میں لے کون گیا؟)

اردو زبان کے دورِ آغاز ہی سے اردو شاعروں کی کبھی سے کوئی کمی نہیں رہی ہے۔ عہد بہ عہد شعراء کے تذکرے اِس کے گواہ ہیں، پھر میر تقی میر جیسے نوک پلک والے اور اپنے کو سارے عالم پر چھایا ہوا سمجھنے والے شاعر نے جن ہم عصر شعراء کو ''نکات الشعراء'' میں

شامل کیا ہوگا، وہ اس دور کے عام شعرامیں قدرے ممتاز افراد ہی رہے ہوں گے۔سیکڑوں چھوٹے موٹے شعراء کو اُنھوں نے نظر انداز کردیا ہوگا ۔ نام اور کلام اُنہیں کا زندہ رہ جاتا ہے جو قافیہ پیمائی سے اوپر اٹھ کراور عام سطح سے آگے جا کر کچھ نیا کر دکھانے کا رجحان رکھتے ہیں۔آج جب اردو زبان کا زوال آخری حد کو چھورہا ہے، یہ ایک بوالعجبی ہی ہے کہ جانے کہاں سے شاعروں کی کھیپ کی کھیپ نمودار ہورہی ہے۔ایسا بھی نہیں کہا جا سکتا کہ اُن میں سب شعراء ناقابلِ التفات ہی ہیں۔اُنہیں میں کچھ ایسے باصلاحیت شاعر بھی ہوتے ہیں جو اپنی ذہانت، مشق اور خوب سے خوب تر کہنے کے شوق کی بدولت پختگی کی منزلوں پر پہنچ کر اہل نظر کی توجہ اپنی جانب کھینچ لیتے ہیں۔تبصرہ نگار اُن کی تحسین وقدردانی پر اپنے کو مجبور پاتا ہے۔ایسے ہی لوگوں میں ''واردات'' کے خالق جناب ارشد جمال اشرفی کا بھی شمار ہے۔

ارشد جمال اشرفی صاحب کو اُن کے کلام کی ہی داد نہیں دینی چاہئے؛ اُس قوت صبروضبط کے لئے بھی سراہا جانا چاہئے کہ اُنھوں نے کس طرح اپنے ملکہ شاعری کو دنیا کی نظروں سے، بلکہ اپنے ملنے جلنے والے احباب سے بھی اُس وقت تک چھپا کر رکھا، جب تک بقول میر ''دردوغم جمع کئے اتنے کہ دیوان کیا'' کے مرحلے تک نہیں پہنچ گئے۔

کہا جاتا ہے کہ مشک اور عشق چھپائے نہیں چھپتے اور میں کہتا ہوں کہ شاعری کو بھی اسی قبیل کی چیز سمجھنا چاہئے۔ یہ نادرالوقوع معاملہ ہے کہ جناب ارشد جمال اشرفی نے اپنے اندرون میں تیزی سے چڑھنے اور جوش مارنے والے اس چشمۂ صافی کے سوتے کو سالہاسال سینے میں دبا کر رکھا تا آنکہ فرشتے نے ٹھوکر مار کر اُسے اعجازی طور پر برآمد نہیں کردیا۔شاید وہی اتالیق ازل جس نے انسان کی تخلیق کر کے اُسے ﴿ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ ﴾ کے امتیاز سے نوازا، اُس نے اپنے اِس تلمیذ خاص کو یہ خفیہ پیغام دیا ہو کہ ''خام ہے تیری فغاں دل میں اسے تھام ابھی!''

جناب ارشد جمال اشرفی بظاہر ایک تقلیدی مسلک سے وابستہ ہونے کے

باوصف غزل کے باب میں تقلیدی نہیں، اجتہادی مذاق رکھتے ہیں۔ اُنھوں نے غزل کی اعلیٰ روایات کی خوبیاں جذب کرنے کے بعد اس زمین میں خود جو لالہ وگل کھلائے ہیں، اُن میں مانگے کا رنگ و بونہیں، بلکہ اُن کی انفرادی فکر ونظر اور اپنے الگ اسلوب کی جلوہ گری نظر آتی ہے۔ اُن کی ۹۰ غزلیں پڑھتے ہوئے قاری کو یک رنگی سے اکتاہٹ کا احساس نہیں ہوتا۔ ہر قدم پر تازہ کاری اور بوقلمونیت کے نظارے ملتے ہیں۔ ایک غزل ختم ہونے پر اگلی غزل دیکھنے کا تقاضہ پیدا ہوتا ہے، فکرِ سخن کے دوران اُنھیں موضوع اور مضمون کی تنگی اور جستجو کا سامان نہیں کرنا پڑتا، کہیں وہ خود کلامی کے ذریعہ اپنی ہی حدیثِ دل بیان کرجاتے ہیں تو کہیں آج کے غیر فطری ماحول، بگڑے ہوئے سماج، غیر منصفانہ نظام، اعلیٰ اقدار کی پامالی اور حیوانوں کو شرمانے والے انسان کی بدنما تصویریں دکھاتے ہیں۔ وہ جو کچھ کہتے ہیں، حساس قاری کو اپنے ہی تجربات ومشاہدات معلوم ہوتے ہیں۔ کامیاب شاعری کی یہی وہ خوبی ہے جو میر وغالب سے لے کر آج تک اچھے شعراء میں وراثتاً منتقل ہوتی آرہی ہے۔ اُن کی شاعری میں حقیقت کا رنگ، تازہ کاری کی کیفیت اور ایک معتدل فضا اِس لئے بھی ملتی ہے کہ اُنھوں نے روایت کے خزانوں پر اپنی دست رس مضبوط رکھتے ہوئے، جدید عصری لب ولہجہ میں آج کے پیش اُفتادہ مسائل پر بے باکانہ اظہارِ خیال کیا ہے۔ روایت و جدت کے اختلاط سے اپنے اسلوب بیان میں ندرت اور ایک نئی لذت پیدا کی ہے، لیکن نام نہاد جدیدیت کے ناقابل فہم استعارات اور ذوق لطیف کو بدمزا کرنے والی لایعنیت اور ابہام وایہام کی لعنت سے دامن بچاتے ہوئے نکل گئے ہیں۔ ''واردات'' میں شامل اُن کی تخلیقات کی قدر و قیمت اُس وقت کچھ اور بڑھ جاتی ہے جب پتہ چلتا ہے کہ یہ فنکار کا نقشِ اولیں ہے، پھر آگے ترقی کرتے ہوئے کس بلندیوں پر پہنچ سکتے ہیں، اس کا اندازہ مشکل نہیں۔ اُن کی غزلوں میں اچھے اشعار کا تناسب زیادہ ہے اور بعض اشعار تو چونکانے اور دامن دل کو تھام لینے والے نکل آتے ہیں۔ بہت سے نوآموز شعراء کے مجموعوں میں سے اچھے اشعار کو بطور نمونہ ڈھونڈ نکالنے میں مشکل ہوتی ہے، لیکن ''واردات'' کا معاملہ ان سے

الگ ہے۔ یہاں یہ فیصلہ کرنا دشوار ہوتا ہے کہ کس اچھے شعر کو چنیں اور کس کو چھوڑ دیں۔

ارشد جمال اشرفی شاعری کے اُفق پر اچانک ایک درخشاں ستارے کی طرح نمودار ہوئے ہیں۔ یہ پیش گوئی کرنا غلط نہ ہوگا کہ اس ستارے کی آب وتاب مستقبل میں مزید بڑھے گی۔ اُن کے اندر فن کی وسعتوں تک پہنچنے کے وسیع امکانات پوشیدہ ہیں، بشرطیکہ وہ اپنے اِس وہبی ملکہ کے ساتھ خود ناقدر شناسی نہ برتیں۔

اشعر رامنگری

یک الف بیش نہیں

ڈاکٹر یعقوب یاور
پروفیسر شعبہ اردو
بی، ایچ، یو، یونیورسٹی، بنارس

زوال آمادہ قوموں کی ایک بڑی علامت یہ بھی ہے کہ اُس کے افراد اپنی تمام تر کاہلی اور بے عملی کے ساتھ تاریخ میں اپنا نام درج کرانے کی مہم میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ 'جس کی لاٹھی اُس کی بھینس' کے جس عہد میں ہم سانسیں لے رہے ہیں، اُس کی تہذیبی شناخت خود تہذیب ہی سے برسر پیکار ہے۔ ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ ہم حسن و قبح، خیر و شر اور حق و باطل میں تمیز کی صلاحیت سے عاری ہو چکے ہیں۔ یہ مسئلہ اب رفتہ رفتہ ہمارے فہم و ادراک سے بالاتر ہوتا جا رہا ہے اور زمانے کی نبض شناسی اب ہمارے لئے قصہ پارینہ بنتی جا رہی ہے۔ رسوم و روایات کی مضبوط زنجیریں ہیں، مذہب و عقائد کی بگڑی ہوئی شکلیں ہیں، تہذیب و تمدن کے نام پر ہونے والی بے راہ روی ہے، جن میں ہم الجھتے چلے جا رہے ہیں اور ہماری روز بروز بڑھتی ہوئی خواہشات کے طفیل عمل کے نام پر ہم سے وہ کچھ سرزد ہو رہا ہے، جن کے بارے میں اب سے کچھ پہلے تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ مسئلہ الجھا ہوا ہے اور بظاہر حل ہماری دسترس میں نہیں ہے تو نتیجہ لازمی طور پر فرار کی شکل میں برآمد ہونا ہے۔ چنانچہ اِس فرار کے دور میں اب ہم مسائل کی جانب متوجہ ہونا تو کجا، اُس سے نظریں چرانے ہی میں عافیت محسوس کرنے لگے ہیں۔ ایسے میں ہر شخص کو بنا کچھ کیے وہ سب کچھ حاصل کرنے کی خواہش ہوتی ہے جو کسی کو بہت کچھ کرنے کے بعد بھی آسانی سے میسر نہیں آتا۔ چنانچہ خود کو عظیم منوانے کے لیے ہم دوسروں کی عظمت کے اعتراف میں مصروف ہو جاتے ہیں اور 'من ترا حاجی بگویم' کا ایک لایعنی اور لامتناہی سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ رفتہ رفتہ ہر شخص اپنے دوش پر عظمت کا ایک مینار ایستادہ محسوس کرتا ہے جو اُس کے رہن سہن،

چال ڈھال اور مزاج وافکار پر اثر انداز ہونے لگتا ہے۔تاریخ کا حصہ بننے کی تگ ودو کے نتیجے میں ہمارے سامنے بے صلاحیت افراد کا ایک ہجوم مجتمع ہورہا ہے۔ ہماری جیبوں میں پہلے کے مقابلے اب زیادہ پیسہ ہے، اِس لئے کتابوں کی اشاعت دشوار نہیں رہی، چنانچہ مطبوعہ کتب کا جو وقار ہمیں وراثت میں ملا تھا وہ رفتہ رفتہ مجروح ہورہا ہے۔ایسے پرآشوب دور میں کتابوں کو دیکھ کر اُسی طرح وحشت ہونے لگی ہے، جیسے کسی زمانے میں غالب کو خطوط دیکھ کر ہونے لگی تھی ۔ ایسے میں ایک سنجیدہ فکر شاعر کی اہمیت کا جواز خود بہ خود پیدا ہوجاتا ہے اور اُس کی ذمہ داریاں دوسروں کے مقابلے میں کچھ زیادہ بڑھ جاتی ہیں۔ ابتری کے اِس ماحول اور مذکورہ پس منظر میں جب میں نے مولانا ارشد جمال اشرفی کا مسودہ پڑھنا شروع کیا تو حیرت انگیز طور پر مجھے ہوا کے ایک تازہ جھونکے کا احساس ہوا۔

ارشد جمال اشرفی؛ عالمِ دین اور ایک موقر درسگاہ کے استاد ہیں۔عموماً ایسا سمجھا جاتا ہے کہ شرعی حلیے کے لوگوں کی شاعری اُسی حلیے کے لوگوں کو اور وہ بھی مساوی مراتب والوں کو نہیں، اُن کے مقلدوں اور شاگردوں کو پسند آتی ہے، لیکن ظاہر ہے یہ کوئی کلیہ نہیں ہوسکتا۔اور اگر یہاں استثنا کی گنجائش نکلتی ہے تو ایسے مستثنیٰ لوگوں میں ارشد جمال اشرفی کو بھی شمار کرنا ہوگا۔فی زمانہ شاید یہ بتادینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اب سے قبل میں ارشد جمال اشرفی کو بالکل نہیں جانتا تھا تاکہ میری تحریر میں تعلقات کے اثر نہ تلاش کئے جائیں۔میرے عزیز دوست غفران امجد نے جب شاعر موصوف کا مجھ سے تعارف کرایا تو میں نے سمجھا کہ یہ حضرت بھی اُن شعرا میں سے ایک ہوں گے جو کم صلاحیت ہونے کے باوجود ہر میدان میں اپنی دَھاک جمانے کی لت میں مبتلا ہوتے ہیں، لیکن جب میں نے اُن کے شعری مسودے کا بہ نظر غائر مطالعہ کیا تو مجھے اپنے اِس خیال میں ترمیم پر مجبور ہونا پڑا۔ یہاں تو اِس عالم رنگ و بو کے پیچ وخم کی ایک حقیقی، دلکش اور متأثر کن عکاسی موجود تھی۔ یہ شاعر دراصل اُن شعرا میں شمار کیے جانے کے لائق ہے جنھیں کھلی آنکھوں سے دنیا کو دیکھنے اور عصری علوم کے حصول کا شوق ہوتا ہے اور جنھیں اپنے حاصل کردہ علم کے اظہار کا سلیقہ بھی

آتا ہے۔ارشد جمال اشرفی نے اپنی تحریروں سے اِس بات کا وافر ثبوت فراہم کیا ہے۔نثر میں بھی اور شعر میں بھی۔چنانچہ اُن کی شاعری میں اظہار کا یہ سلیقہ جابہ جا اپنا جلوہ دکھاتا ہے۔

اُن کی شاعری میں پہلی بات جو اپنی جانب متوجہ کرتی ہے وہ اُن کے کتب و کائنات کے مطالعے کی یہی وسعت ہے۔اُنھیں اِس بات کا بخوبی علم بھی ہے کہ موضوعات کے اعتبار سے ماضی کے شعرانے ایسا کچھ باقی نہیں چھوڑا ہے جس پر طبع آزمائی کی جاسکے۔ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ اگر شاعر کے پاس سلیقہ ہو تو اُن کہی گئی باتوں کو اپنے طور پر ایک نئے انداز میں پیش کیا جاسکتا ہے۔مندرجہ ذیل اشعار میں اُن کے اِسی رویے کی جھلک دیکھی جاسکتی ہے۔

بے ہنر بے نام میں رہتا تو ارشدؔ ٹھیک تھا
مجھ سے اتنی آسماں کو دشمنی ہوتی نہیں

(ارشد)

ہم کہاں کے دانا تھے ،کس ہنر میں یکتا تھے
بے سبب ہوا غالب دشمن آسماں اپنا

(غالب)

جگہ دل میں بہت کچھ دردِ فرقت کے سوا بھی ہے
بہت سا کام دنیا میں محبت کے سوا بھی ہے

(ارشد)

اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا

(فیض)

ہمارا سچ سرِ بازار ہوگیا رسوا
وہ جھوٹ بول کے بھی کامیاب کتنا ہے

(ارشد)

میں سچ کہوں گی مگر پھر بھی ہار جاؤں گی
وہ جھوٹ بولے گا اور لاجواب کردے گا

(پروین شاکر)

یہ تو محض بانگی کے چند دانے ہیں جو مشتے ازخروارے یہاں وہاں سے پیش کر دیے گئے ہیں۔ایک پھول کے مضمون کو سو رنگ میں باندھنے،استفادہ اور موضوعات و مضامین کی ترتیب نو اُن کے مزاج کا خاصہ ہے،جس کے نمونے اُن کے کلام میں جابہ جا بکھرے نظر آجائیں گے۔شمع سے شمع جلاکر حال کی مدد سے مستقبل کو سنوارنے اور منور کرنے کی اُنھوں نے قابل ستائش کوشش کی ہے۔یہ الگ بات ہے کہ اُن کی یہ کوشش ہر جگہ اتنی کامیاب ثابت نہیں ہوئی ہے جتنی ہونی چاہئے تھی،لیکن جہاں جہاں اُنھیں کامیابی ملی ہے،ذہن ودل کے دریچے کھل جاتے ہیں اور طمانیت کا احساس ہوتا ہے۔

عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ اپنی روایات سے منسلک شاعر ماضی پرستی کے سحر میں ایسا ڈوب جاتا ہے کہ اُسے اپنے عہد اور اپنے آس پاس کی دنیا کی خبر ہی نہیں رہتی ،لیکن ارشد جمال اشرفی نے خود کو اس خرابی سے محفوظ رکھا ہے۔اُن کے یہاں جدید اسلوب کو برتنے ، نئے موضوعات کی تلاش اور عصری مسائل کے اظہار کا رجحان موجود ہے۔یہی نہیں انھوں نے اس اظہار کے لیے جن لفظیات اور جس لہجے کا انتخاب کیا ہے وہ زبان کے عصری تقاضوں کے نہ صرف عین مطابق ہیں، بلکہ فطری بھی معلوم ہوتے ہیں۔یعنی ارشد کی 'شعر گوئی کافن'،'شعر سازی' کے فن سے مختلف ہے اور اُن کی شاعری میں اِس بات کے واضح شواہد موجود ہیں کہ وہ شاعری کے سر بستہ اسرار و رموز سے آشنا ہیں۔درج ذیل چند اشعار میری اِس بات کی تصدیق کے لیے کافی ہوں گے۔

اُس کی آنکھیں تجوری کو تکتی رہیں
چین سے سوگئی مفلسی رات میں

☆☆☆

اُس کو فٹ پاتھ پہ آرام کی نیند آتی ہے
ہم نے بستر پہ بھی سکھ چین گنوا رکھا ہے

☆☆☆

ہم ہیں دکھ کے مارے لوگ
دور ہیں اپنے پیارے لوگ

☆☆☆

سیکڑوں سے پوچھ کر رستہ بھٹک کر رہ گیا
رہنما اتنے نہ تھے تو گمرہی اتنی نہ تھی

☆☆☆

نہ درد ہے نہ مروت کی روح ہے ارشؔد
اس آدمی میں وہی کچھ ہے جو مشین میں ہے

☆☆☆

میرے گھر میں پہلے ہی سے غم کا اک دروازہ تھا
رخنہ کس نے ڈال دیا ہے خوشیوں کی دیواروں میں

☆☆☆

نہ جانے کیوں وہ اپنی خلوتوں سے دور کرتے ہیں
مجھے دنیا میں جینے کے لیے مجبور کرتے ہیں

ان اشعار سے آپ کو اندازہ ہوا ہوگا کہ ارشد جمال اشرفی کے پاس اپنی بات کو موثر پیرائے میں کہنے کا سلیقہ موجود ہے۔آپ نے یہ بھی محسوس کیا ہوگا کہ ان اشعار میں فہم و شعور اور روایت کی بازیافت باہم شیر وشکر ہیں۔اس کے ساتھ ساتھ غم کی وہ زیریں لہر بھی اپنا کام کر رہی ہے جو ایک طرف تو اشعار کو بلندی سے ہم کنار کرتی ہے اور دوسری طرف ایسے اشعار کو وقت کی حد بندیوں سے آزاد کر دیتی ہے۔

ارشد جمال اشرفی کے یہاں عصری مسائل بھی دوطرح کے ہیں۔ایک عمومی مسائل یعنی وہ جوآفاقی ہیں اور کسی کواُس کا ذاتی تجربہ بھلے ہی نہ ہو وہ اُن سے اچھی طرح واقف ہوتا ہے۔ارشد جمال اشرفی کے یہاں ایسے شنیدہ مسائل کو کثرت سے اٹھایا گیا ہے حالانکہ اس معاملے میں اُن کا انداز اختراعی اور تجریدی کم اور تقلیدی اور روایتی زیادہ نظر آتا ہے،لیکن وہ مسائل ، جوان کے آس پاس ہیں اور جن سے وہ خود نبردآزما بھی ہیں جب اُن کی شاعری کے لیے خام مواد فراہم کرتے ہیں اور اپنی بھرپور قوت کے ساتھ اشعار کا جامہ پہنتے ہیں تو وجود میں آنے والے ایسے اشعار سامع یا قاری پر ایک ساحرانہ کیفیت طاری کردیتے ہیں ۔اُن کی غزل کا محبوب اگرچہ تقلیدی ہے،لیکن اُس میں بھی ایک بانکپن کی کیفیت درآئی ہے ۔اُن کی شاعری کا لہجہ متکلم کا لہجہ ہے۔یہاں متکلم سے میری مراد صاحب فلسفہ وکلام نہیں ، بلکہ ضمیر کا وہ صیغہ ہے جوخود کلام کرتا ہے۔ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عام طور پر شاعر اجتماعی تجربات کے اظہار میں روایتی اور ذاتی یا انفرادی تجربات کے اظہار میں جدت پسند ہے، پھر بھی جہاں جہاں یہ قران السعدین واقع ہوا ہے اُن کی شاعری کا اثر دوبالا ہو گیا ہے۔

آخری بات جو مجھے اِس شعری مجموعے کے قارئین سے کہنی ہے۔وہ یہ کہ آپ اِس شاعر کو ہلکے میں نہ لیں ۔یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ ہمارے زمانے میں ناقص شعری مجموعوں کی اشاعت پر بہار آئی ہوئی ہے۔ادب کا ہر قاری جانتا ہے کہ اُن کا معیار کیا ہوتا ہے ۔اِس لیے مجھے یہ کہنے کی ضرورت پڑ رہی ہے کہ شاعری کے مجموعوں کی اس نامقصود بھیڑ میں یہ مجموعہ دوسروں سے یکسر مختلف ہے۔اِس کا مطالعہ کرکے آپ کو مایوسی نہیں ہوگی، بلکہ یہاں آپ کو ایسے آب دار گوہر دستیاب ہوں گے جوآپ کی روح کی غذا بن سکیں۔

یعقوب یاور

لعل ہشت پہل......ارشد جمال اشرفی

مولانا نصیر احمد، نصیؔر سراجی
ناظم اعلیٰ جامعہ ضیاء العلوم، کچی باغ، بنارس

خدا سلامت رکھے! مولانا ارشد جمال اشرفی صاحب بڑی تہہ دار شخصیت کے حامل ہیں۔

یادش بخیر۷-۸سال قبل میری اُن سے ملاقات ہوئی۔میں ماہ نامہ ''تعلیمات جدید'' کا ایڈیٹر اور ارشد صاحب ''نوری کمپیوٹر'' کے مالک۔کمپوزنگ کے سلسلے میں ایک دن الحاج ڈاکٹر مقبول احمد اشرفی صاحب کے ساتھ غریب خانے پر آئے۔سلام ومصافحہ کے بعد کچھ کاروباری اور کچھ علمی گفتگو ہوئی۔معلوم ہوا کہ آپ جامعہ فاروقیہ سے سند فراغت حاصل کر چکے ہیں اور فی الحال مدرسہ حمیدیہ (شکرتالاب، بنارس) میں تدریسی خدمات انجام دے رہے ہیں۔یہ بس ایک تعارفی ملاقات تھی،مگر اس مختصر سی ملاقات سے بھی اتنا ضرور اندازہ ہوا کہ یہ کم سخن محتاط، باوقار،سنجیدہ اور کم آمیز عالم دین، عام فضلاء مدارس سے کچھ الگ مزاج رکھتے ہیں اور نصابی کتابوں کے علاوہ بھی بہت کچھ پڑھتے اور خوب غور کرتے رہتے ہیں۔کچھ دنوں بعد جب ''تعلیمات جدید'' کی کمپوزنگ ان کے ''نوری کمپیوٹر'' میں ہونے لگی تو ملنے جلنے کا سلسلہ بڑھتا گیا اور اُن کی تہہ دار شخصیت کی تہیں یکے بعد دیگرے کھلتی گئیں۔کبھی میں اُن کے آفس چلا جاتا کبھی وہ میرے گھر آجاتے۔متعدد علمی مسائل پر دیر تک گفتگو،متشددانہ ماحول میں تعلیم وتعلم اور پرداخت کے باوجود غیر متعصّبانہ اور معتدل طریق فکر، اکابر کی غیر درسی تصانیف کا مطالعہ، حتیٰ کہ ابن تیمیہ اور ابن قیم جیسے محققین......جنہیں بہت سے علمی مراکز میں شجر ممنوعہ گردانا جاتا ہے......کی تحریروں سے علمی اکتساب، اُن کی محققانہ نگارشات کی تحسین اور تحقیقی غلطیوں پر مناسب تنقید، گفتگو کے دوران اُن کا مہذب، متین اور سنجیدہ لب ولہجہ......مخاطب کی درست اور مناسب باتوں کو بلاچون و چرا قبول کر لینے کا وطیرہ، ہر لمحہ علمی تجسس اور مزید حاصل کرنے کی والہانہ تڑپ،

ارشد صاحب کے یہ وہ اوصاف تھے جن کی وجہ سے اُن کے لئے میرے دل میں جگہ بنتی گئی۔
تنظیم اہلسنت (بنارس) کے سہ روزہ اجلاس میں پہلی بار مجھے اُن کی تقریر سننے کا موقع ملا اور میری نگاہ میں اُن کی قدر و قیمت اور بڑھ گئی۔ نہ سکۂ رائج الوقت کی طرح جلسوں میں چلنے والے مقررین کی گھن گرج، سامعہ خراشی اور بلا وجہ چیخ و پکار، نہ کم خواندہ جبہ پوشوں اور دستار بندوں کی طرح زیب داستاں کے لئے موضوع روایت اور جھوٹی کرامات کا سہارا، نہ ''لڑاؤ اور حکومت کرو'' کے تخریبی نظریے کے حامل مفسدہ پرداز خطیبوں کا جدلی اور ردّی (تردیدی) طرزِ خطاب، نہ لفظوں کی بھیڑ بھاڑ میں معنی ومفہوم کو پس پشت ڈال دینے والا انداز بیان، نہ جھلاہٹ اور جھنجھلاہٹ، نہ چند گھسے پٹے نکات کی بار بار تکرار، بلکہ سلیس و سادہ نپے تلے جملے، منطقی اور فلسفیانہ طریق استدلال، شائستہ وشگفتہ اور دلنشیں اسلوب بیان، آیات قرآنیہ، احادیث نبویہ اور اقوال سلف کے جواہر پاروں سے مرصّع خطاب...... یہ تقریر سن کر میرے لئے ارشد صاحب کی شخصیت کی ایک اور نادیدہ تہہ کھل گئی اور دل پر تاثر کا رنگ اور گہرا ہو گیا۔
ارشد صاحب کا مزاج مولویت سے زیادہ صوفیت سے میل کھاتا ہے۔ طنز وتنقید کی بجائے گہری خاموشی، رنگینی کی بجائے سادگی، تلخ گفتاری کی بجائے شیریں مقالی، انانیت کی بجائے کسرنفسی، ضد کی بجائے قبولِ حق کا حوصلہ، نفرت کی بجائے محبت کی دعوت، یہ تمام باتیں شہادت دیتی تھیں کہ اُن کے سینہ کے اندر ایک درویش صوفی کا دل دھڑک رہا ہے۔ اُن سے گفتگو کے دوران میں نے بارہا محسوس کیا کہ اُن کے اندرون میں اسلامی تصوف کا پاکیزہ اور نتھرا ہوا ذوق موجود ہے۔
کچھ عرصہ بعد اُن کی شخصیت کی ایک اور تہہ کھلی۔ اُنھیں تصنیف و تالیف کا بھی ہنر آتا تھا۔ فراغت کے بعد اُن کے رشحات قلم سے چار پانچ کتابیں نکلیں۔ جن میں سے ایک کتابچہ ''فلسفۂ روزہ'' کے نام سے شائع بھی ہوا، پھر اُن کے پیرومرشد حضرت مولانا سید اظہار اشرف صاحب قبلہ (سجادہ نشین خانقاہ اشرفیہ حسنیہ سرکارکلاں، کچھوچھہ شریف) کی

دوررَس، دروں بیں اور جوھر شناس نگاھوں نے اس جوھرقابل کو اپنے علمی ادارہ جامع اشرف میں تدریس کے لئے منتخب فرمالیا۔ یہاں آکر درس و تدریس کے علاوہ تصنیف و تالیف کا مشغلہ بدستور جاری رہا، چنانچہ اُن کے خامۂ گوہر بار سے ۳-۴ سال کے مختصر سے عرصہ میں متعدد کتابیں منصۂ شہود پر ظاہر ہوگئیں۔ مقامِ غوثیت، کتاب الابدال، عمامہ اور ٹوپی کی شرعی حیثیت، دھماکہ اور چنگھاڑ کا ایک شرعی جائزہ، خالق کائنات سائنسی حقائق کی روشنی میں وغیرہ..... یہ ساری کتابیں اگر چہ کمیت کے اعتبار سے مختصر ہیں، مگر کیفیت کے لحاظ سے بہت سی ضخیم تصانیف سے زیادہ قیمتی ہیں۔ اس کو کہتے ہیں بقامت کہتر بقیمت بہتر۔ ہر نئ تصنیف اسلوب نگارش میں ماقبل تصنیف سے بہتر۔ قلم رواں ہوتا گیا، فن میں تدریجی پختگی آتی گئی اور تحریر میں دلکشی و جاذبیت جگہ پاتی گئی۔ مؤخرالذکر تصنیف ''خالق کائنات سائنسی حقائق کی روشنی میں'' طرز بیان کے اعتبار سے اُن کی تمام تصنیفات میں شہ کار کا درجہ رکھتی ہے۔ ایک سال قبل انھوں نے حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کی ''جلاء الخاطر'' کا ترجمہ ''راہِ الٰہی'' کے نام سے پیش کیا جو بارگاہ غوثیت سے اُن کی روحانی نسبت اور قلبی وابستگی کا پاکیزہ اور روشن اظہار ہے۔ ارباب فن جانتے ہیں کہ ترجمہ نگاری کی راہ بہت کٹھن ہے۔ اُس کا ادبی حسن یہ ہے کہ وہ قاری کو ترجمہ کی بجائے مستقل تصنیف محسوس ہو، لیکن یہ بھی لازمی ہے کہ حسن بیان کے اظہار میں مصنف کی منشا معدوم نہ ہوجائے۔ ارشد صاحب ترجمہ کی سنگلاخ وادی سے بھی بڑی احتیاط کے ساتھ گذرے ہیں اور کامیابی سے ہم کنار ہوئے ہیں۔

ارشد صاحب کبھی کبھی گفتگو کے دوران ادبی مباحث بھی چھیڑ دیتے۔ اُن کی بحث کا محور نثری اصناف (ناول، افسانہ، انشائیہ، خاکہ نگاری وغیرہ) کی بجائے صرف شعری ادب ہوتا اور وہ بھی عہد حاضر کے مشہور شعراء کی تخلیقات تک محدود رہتا۔ ایک دن انکشاف ہوا کہ آپ بھی شعرنگاری کا شوق پالے بیٹھے ہیں۔ دوران تعلیم میں نے دیکھا ہے کہ درس نظامی کے کچھ طلبہ الہ آباد بورڈ کے نصاب کی تیاری کرتے ہوئے امین الکافی وغیرہ کا مطالعہ

کرتے ہیں تو فاعلاتن فاعلاتن فاعلن کرتے کرتے قافیہ پیمائی کرنے لگتے ہیں۔ابتدائی دور کے یہ اشعار قطعاً نا قابل اعتنا ہوتے ہیں۔اکثر یہ شوق وقتی اور غیر مستقل ثابت ہوتا ہے۔ چراغ رہ گذر کی طرح کچھ دیر روشنی بکھیرتا ہے پھر ہوا کے کسی تیز رَو جھونکے کی نذر ہو جاتا ہے۔جب مجھے معلوم ہوا کہ ارشد صاحب بھی اس دشت کی سیاحی میں مصروف ہیں تو گمان گذرا کہ آنجناب بھی اُن تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل میں سے ہوں گے جو بڑے ارمان سے محفل شعروسخن میں شریک ہوتے ہیں لیکن جلد ہی الوداعی سلام کہہ کر ہمیشہ کے لئے رخصت ہو جاتے ہیں اور یادگار کے طور پر چند آڑی ترچھی لکیریں اُن کی بیاض میں پڑی رہ جاتی ہیں،لیکن اُس وقت میری حیرتوں کا ٹھکانا نہ رہا جب ارشد صاحب میرے پاس مکمل مجموعۂ غزل لے کر وارد ہوئے۔میں تعجب سے کبھی اُنھیں دیکھتا کبھی اپنے سامنے پڑے ہوئے کاغذات کو۔میں نے پوچھا: مولانا صاحب! یہ کیا ہے؟ فرمایا: غزلوں کا مجموعہ۔ اسے چھپوانا چاہتا ہوں اور آپ سے کچھ لکھوانا چاہتا ہوں۔میں سوچ رہا تھا کہ یہ شخص کتنی تہہ دار شخصیت کا مالک ہے۔بارہا ملاقات کے باوجود تا ہنوز اِس کے اِس وصف سے نا آشنا تھا۔ابتداءً میں نے اپنی کم علمی اور بے بضاعتی کی بنا پر لکھنے سے معذرت کی،مگر اُن کے پیہم مخلصانہ اصرار کے آگے سپر انداز ہونا پڑا کہ خیالِ خاطرِ احباب بھی تو ضروری ہے ورنہ آبگینے کو ٹھیس لگنے سے کون بچا سکتا ہے؟ اُن کے جانے کے بعد بے دلی سے مجموعہ اٹھایا (خدا میری بدگمانی معاف کرے!) سوچا تھا کہ وہی گھسے پٹے انداز میں گل وبلبل کی داستان ہوگی،ساغر ومینا کا تذکرہ ہوگا،زلف ورخسار کی باتیں ہوں گی،ہجر وفراق کی کیفیات کا بیان ہوگا،وصال کی آرزو ہوگی،رقیبوں کی شکایت ہوگی،نامہ وپیام ہوگا،یاسیت اور قنوطیت کی دھند میں لپٹے ہوئے جذبات ہوں گے،رزم گاہ حیات سے فرار کی تبلیغ ہوگی،زاہد وشیخ اور محتسب پر طنز وتشنیع کی بوچھار ہوگی اور ادب برائے ادب کے ناقص اور از کار رفتہ نظریے کی نمائندہ کتابوں کی بھیڑ میں ایک اور کتاب کا اضافہ ہوگا،لیکن درمیان سے جب ایک صفحہ کھولا تو پہلا ہی شعر پڑھ کر چونک پڑا۔بے دلی نشاطِ خاطر میں تبدیل ہوگئی۔دل پر ایک

مسرت انگیز استعجابی کیفیت طاری ہوگئی اور ایک ہی سانس میں پوری غزل پڑھ ڈالی۔ غزل یہ تھی۔

جو میرے دل میں کبھی تھا اب آستین میں ہے
وفا کا نام زمیں پر ، وفا زمین میں ہے
حویلی والے بھی چکر ادھر لگاتے ہیں
مکاں میں کچھ نہیں ،سب کچھ مگر مکین میں ہے
بسا کرے گا ہمیشہ ہی دشتِ بے دینی
بہت ہی تنگ جگہ جب تمھارے دین میں ہے
دعا کرو کہ مرے درد کا پتہ چل جائے
بہت دنوں سے مری فکر چھان بین میں ہے
نہ درد ہے نہ مروت کی روح ہے ارشدؔ
اس آدمی میں وہی کچھ ہے جو مشین میں ہے

پہلی ہی غزل پڑھ کر ذہن سے بدگمانی کی کہر چھٹ گئی اور اعتراف کرنا پڑا کہ ارشد صاحب یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ۔

وقت بدلا ،فکر بدلی ،اب تقاضے اور ہیں
چھوڑ ارشدؔ وہ پرانی شاعری اچھی نہیں

پھر تو جب موقع ملا از اول تا آخر جستہ جستہ پورا مجموعہ لفظ بہ لفظ پڑھ ڈالا اور اِس نتیجے پر پہنچا کہ ارشد صاحب کی شاعری آسمانی معارف کی ترجمان ہونے کے باوصف زمینی حقائق سے جڑی ہوئی ہے۔اُن کی تخلیقات کی بنیاد وہم وقیاس اور موہوم تخیلات کی بھربھری ریت پر نہیں ، بلکہ یقین واعتماد کی ٹھوس زمین پر ہے جو تجربات ومشاہدات سے پیدا ہوتا ہے۔اُن کا فن ’’اے سی برائیڈلے‘‘ کے اِس قول کی نمائندگی کرتا ہے’’شاعری اور زندگی کے درمیان ایک گہرا تعلق ہے اور اس تعلق کی طنابیں گویا زیرِ زمین ہیں‘‘۔

ارشد صاحب کی نگاہِ مشاہدہ بہت تیز ہے۔وہ بڑی باریک بینی سے اپنے گردو پیش کا تجزیہ کرتے ہیں۔اُن کی نظریں امراء کے فلک بوس محلات کے ساتھ ساتھ فاقہ کش فقیروں کی جھونپڑیوں میں بھی جھانک کر دیکھتی ہیں۔وہ سماج کے ایک ایک طبقہ کے مزاج،احوال اور مشغولیت کو بنظرِ غائر دیکھتے ہیں اور بے لاگ محاکمہ کرتے ہیں،حتیٰ کہ خود صاحبِ جبہ ودستار ہونے کے باوصف؛ دینی مزاج،اخلاقی اقدار،اسلامی حکمتوں اور ایمانی روح سے محروم صاحبان جبہ ودستار کے تشدد اور تنگ نظری کا بھی سخت محاسبہ کرنے سے گریز نہیں کرتے اور بڑی بے باکی سے اعلان کرتے ہیں۔

مجھ کو ٹکٹ جنت کا نہ دیں گے پگڑی جبے والے لوگ
زیرِ غور ہے میرا ایماں دین کے ٹھیکیداروں میں

ہمارے دین میں تو درد مندی اصل ہے واعظ
ترا دیں فتویٔ کفر و ضلالت کے سوا بھی ہے

وہ لوگ جو کبھی حق آشنا نہ تھے ارشدؔ
اُنہی سے میرے عقیدے کا فیصلہ ہوگا

مری ارشدؔ اُس سے کہاں نبھے،میں دلیل وفکر کا آدمی
وہ روایتوں پہ اَڑا ہوا ، وہ توہّموں پہ ڈٹا ہوا

میرا عقیدہ جانچ کریں گے دین کے سارے آوارے
حق بے چارہ اوندھے منہ تھا آفت ہونے والی تھی

اِن شعروں کے اندر جو کسک،تڑپ اور دردمندی ہے وہ اہل نظر حضرات سے

پوشیدہ نہیں، چونکہ خود ارشد صاحب ''بھکت بھوگی'' ہیں اِس لئے اُن کے یہ بیانات جگ بیتی کی بجائے آپ بیتی ہیں۔ دلِ درد مند رکھنے والا یہ شاعر کس کرب کے ساتھ کہتا ہے ۔

سب کو پتہ ہے حال مرا ، بس یہ بغض ہے
مشکوک کہنے والے مجھے جانتے نہیں؟

''مشکوک کہنے والے مجھے جانتے نہیں؟'' کے استفہام کے اندر اُن کے دل کا سارا کرب چھپا ہوا ہے۔ ''ورڈ ورتھ'' نے شاعری کو چھلکتے ہوئے جذبات سے تعبیر کیا ہے۔ انسانی سماج کے مفاسد ارشد صاحب کو تڑپاتے اور رُلاتے ہیں اور قلم کی ذرا سی جنبش سے ان کے کرب آگیں جذبات کے سوتے بہنے لگتے ہیں۔ اُن کے دل کی ٹیس اور اُن کے وجود کے اندر چھپا ہوا درد، شعری پیکر تراشتا ہے اور رعنائی فن سے ہم آغوش ہوتا ہوا قاری کے دل میں گہرائی تک اتر جاتا ہے۔ نئی تہذیب کے مفاسد اور شاعر کے درد و غم کی کیسی کیسی اندوہ ناک اور عبرت خیز تصویریں چھپی ہیں اِن شعروں کے اندر ۔

میں زندہ لاش ہوں مجھ کو نہ گننا
اگر مردم شماری ہو رہی ہے

دل پہ رکھیں کہاں کہاں مرہم
زخم تو بے شمار آئے ہیں

دل کی کالک دن بہ دن بڑھتی گئی
اپنے جسموں کو بہت نہلا چکے

کچھ شریفوں نے بھی گھر آ کر بسائے ہیں یہاں
اس محلے میں کبھی آوارگی اتنی نہ تھی

تہذیب نئی ، دور نیا ، فکر نئی ہے
اللہ پہ بھی لوگ بھروسا نہیں کرتے

آدم کا خاندان کہاں جاکے بس گیا
میں نے بہت تلاش کیا آدمی کا گھر

میرے آقاؤ! یہ کھیل نکالا تم نے
میری عزت ہے یہ بچوں کا کھلونا تو نہیں

ظلم ووحشت رہتے ہیں ارشدؔ آبادی میں شب بیدار
نیکی،شرافت سوئی پڑی ہے جاکے پرانے غاروں میں

وہ دولت کا حوالہ لے کر آیا فوراً کام ہوا
ورنہ لوگ کھڑے تھے کب سے لمبی لمبی قطاروں میں

وہ کسی غریب کی بھول تھی جو سڑک پہ ننگی کھڑی رہی
یہ امیرزادے کا جرم ہے، کئی عزتوں میں چھپا ہوا

کس ہنرمندی سے پھولوں کا ہوا بٹوارہ
میرے حصے میں وہی باغ کا پتھر آیا

گاؤں کی عزت اِن کی رَکھیل
یہ ہیں راج دُلارے لوگ

جنگ وجدل، قتل وغارت گری، آتش زنی اور قوم کشی کے خونیں مناظر دیکھ کر کس کا دل نہیں تڑپتا؟ لہو میں لتھڑی ہوئی لاشیں، جلے ہوئے مکانات، خواتین کی بیوگی اور معصوم بچوں کی یتیمی پر کس کی آنکھ اشکبار نہیں ہو جاتی؟ مگر ارشد صاحب کی برّاقی نظر اور قوتِ مشاہدہ حال کے پردوں کو چاک کر کے مستقبل کے نہاں خانہ کا جائزہ لیتی ہے۔ اُن کی نگاہ زمانۂ آئندہ کے اُن نقیبوں پر بھی ہے جو ابھی عہد طفلی سے گذر رہے ہیں اور اُن خوں فشاں، خانہ سوز اور لرزہ بر اندام مناظر کو اپنے حافظہ کی ریل میں محفوظ کر چکے ہیں۔ ارشد صاحب اپنے خونِ جگر کو روشنائی بنا کر کتنے درد بھرے انداز میں لکھتے ہیں ؎

توپ طمنچوں کا جو منظر دیکھا ہے اِن بچوں نے
ارشدؔ کھیل کھلونے دے کر خاک اِنہیں بہلاؤ گے

اُس چیختے جلتے ہوئے منظر میں یہ بچے
اب اِن کو کھلونوں سے تو بہلا نہ سکو گے

گولیاں ، بارود اِن بچوں کو دو
ہم کھلونوں سے اِنہیں بہلا چکے

ان مخالف اور ناسازگار حالات کے باوجود ارشد صاحب مایوسیوں کے شکار نہیں ہوتے بلکہ عزائم کے روشن چراغ لے کر ظلماتِ شب کو نابود کرنے کا حوصلہ رکھتے ہیں ؎

آمدِ صبح کے منتظر کیوں رہیں
ہم اگائیں گے سورج اسی رات میں

جبر کی ظلمتوں سے میں لڑتا رہا
ہار کر کیوں کروں خودکشی رات میں

ہم رات کے راہی ہیں ہمیں کام بہت ہے
سورج کے بھروسے پہ سویرا نہیں کرتے

نظامِ زندگی پھر سے بنانے کی ضرورت ہے
کہ گرتی چھت کو مل جل کر اٹھانے کی ضرورت ہے

سات سمندر دور نکل کر اپنی منزل آئے گی
ساتھیو! تھک کر بیٹھو گے تو بیٹھے ہی رہ جاؤ گے

اب مجھے پُر خار راہوں کا کوئی کھٹکا نہیں
تیز رَو میں ہو گیا ہوں آبلہ پائی کے بعد

جینے کی ایک بچے نے کھائی قسم وہاں!
جب اُس کے خاندان میں کوئی بچا نہ تھا

ارشد صاحب نے جھوٹ اور سچ کا لفظ بار بار استعمال کیا ہے۔ جھوٹ لغت میں خلافِ واقعہ بیان کو کہتے ہیں ،لیکن وہ اس لفظ کو معنوی وسعت بخشتے ہیں اور انسانی معاشرے میں در آنے والی تمام خرابیوں اور نقائص کو جھوٹ سے تعبیر کرتے ہیں اور اس کے برعکس حقیقت کے لئے سچ کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ در حقیقت یہ دونوں الفاظ شاعر کے علامتی تلازمات ہیں جن کے ذریعہ وہ سماج کے مفاسد کو بے نقاب کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں اُن کا اسلوب کبھی بیانیہ ہوتا ہے، کبھی طنزیہ اور کبھی باغیانہ اور مجاہدانہ۔

مرا سچ بیچ چوراہے پہ ننگا ہو گیا کیونکہ
ترے حق میں فقیہ شہر کی روشن گواہی تھی

ہمارا سچ سرِ بازار ہوگیا رسوا
وہ جھوٹ بول کے بھی کامیاب کتنا ہے

بہتر ہے اسے سچ کے اجالوں میں چھپادو
تم اتنے بڑے جھوٹ کو دفنا نہ سکوگے

وہ جھوٹ ننگی سڑک پر اٹھائے پھرتا ہے
میں اپنے سچ کو چھپاؤں یہ بے بسی میری

جھوٹ اپنی جیت پر ہنستا رہا
آپ ارشد سچ بہت فرما چکے

ٹوٹ سکتی ہے مگر جھک نہیں سکتی یہ کمر
جھوٹ کی سِل بھی مرے سچ پہ اگر تو رکھ دے

سچ اگلنے پر زباں کٹتی ہے آخر کیا کروں؟
جھوٹ کے اِس راج میں میں بے زباں ہونے لگا

سچی اور کھری باتوں کی میری دکان اجڑ ہی گئی
جب سے ہونے لگی ہے ضمیر فروشی ان بازاروں میں

دیا سچ کا پریشاں ہوگیا جھوٹی ہواؤں سے
جسے جلنا تھا اب اس کو بجھانے کی ضرورت ہے

ہوش مندوں کو بھلا یاد تھا سچ کا انجام
وہ قلندر تھا جو بازار میں سر بھول گیا

عہو دگذشتہ کی طرح عصر حاضر کا بہت بڑا المیہ انسان کے اندر افراط زر کی بے لگام خواہش ہے جو سنامی لہروں کی طرح اخلاقی اقدار کو روندتی، تہذیبی صالحیت کو پامال کرتی اور انسانیت کے حدود کو توڑتی ہوئی سرپٹ بھاگی جاتی ہے۔ایسے انسان کے جذبۂ بلانوش کو کبھی آسودگی اور سیری میسر نہیں ہوتی۔اُس کا ذہن ہر وقت کرب واذیت میں مبتلا رہتا ہے اُس کی حرص وآز کا جہنم ہر لحظہ ھل من مزید کی صدا لگاتا رہتا ہے۔سیم وزر اور لعل وجواھر کے خزانے سمیٹ لینے کے باوجود وہ استغنا کی نعمت سے محروم اور اُس کی لامتناہی تمناؤں کا دامن تسکین کی دولت سے خالی رہتا ہے۔اس کے دن ہمہ طلبی کے جال بننے میں گذر جاتے ہیں اور راتیں بے خوابی کی نذر ہو جاتی ہیں،لیکن وہ خوش نصیب افراد جنہیں قناعت کی نعمت غیر مترقبہ حاصل ہو جاتی ہے۔روکھی سوکھی کھا کر بھی سکون کا سانس لیتے ہیں اور کھردرے بستر پر بھی چین کی نیند سو جاتے ہیں۔ارشد صاحب اس حقیقت کو کتنی سادگی اور پُرکاری سے بیان کرتے ہیں۔

اُس کی آنکھیں تجوری کو تکتی رہیں
چین سے سوگئی مفلسی رات میں

اُس کو فٹ پاتھ پہ آرام کی نیند آتی ہے
ہم نے بستر پہ بھی سکھ چین گنوا رکھا ہے

اس ذہنی کرب سے چھٹکارا پانے کی واحد سبیل یہی ہے کہ دنیائے فانی کی بجائے عالم جاودانی کی فکر کو ترجیح دی جائے۔موت سب سے بڑی حقیقت ہے اور سب کو اس کا سامنا کرنا ہے۔اس کا تصور انسان کو مادی آسودگی کی مہلک دلدل سے نکالتا ہے۔اسی لئے ارشد صاحب بار بار لہجہ بدل بدل کر کائنات کی فنائیت کا نظریہ پیش کرتے ہیں۔

پھر وہی شبنم کا مٹنا پرتوِ خورشید سے
پھر وہی دورِ خزاں گلشن کی رعنائی کے بعد

وہ آفتابِ زمانہ ضرور تھا لیکن
بلندیوں پہ پہنچ کر زوال تھا اُس کا

مسافر تھک کے سویا زندگی کا
بڑی لمبی تمنا کی سڑک ہے
ڈھلتی چھاؤں ہے یہ دنیا جیسے
تو نے اے دوست! شجر دیکھا ہے

میں اگر ہوں پیڑ کا سایہ تو تم صحرا کی ریت
یا حقیقت کچھ نہیں یا دیرپا کوئی نہیں

کاغذ کی کسی ناؤ کے مانند ہے ہستی
جیتے ہیں مگر جینے کا دعویٰ نہیں کرتے

سانس ٹوٹے گی تو مٹی کا بچھونا ہوگا
پھول کی سیج پہ سوتے ہوئے ڈر لگتا ہے

بند بھی کر لو چاہے دنیا اپنی دونوں مٹھی میں
خالی ہاتھ تم آئے تھے اور خالی ہاتھ ہی جاؤ گے

ارشد صاحب موت کی حقیقت کو نئے نئے اسالیب میں پیش کرنے کے باوجود اس سے ہراساں اور سراسیمہ نہیں ہوتے۔انہیں یقین ہے کہ موت ایک پڑاؤ ہے، اس کے بعد حیاتِ نو کا ایسا باب شروع ہوگا جس کے لئے حدّ اختتام اور خطّ تمت نہیں۔اسلوب کی کس تازہ کاری کے ساتھ وہ کہتے ہیں۔

زندگی دیر تک مجھ کو تکتی رہی ، پھر ملاقات کا عہد کرتے ہوئے
منہ پہ چادر اداسی کے تانے ہوئے ،موت ارشدؔ! مرے ساتھ چلنے لگی

''پھر ملاقات کا عہد کرتے ہوئے''ایک نئی زندگی کے لئے بڑا ہی دلپذیر اندازِ بیان ہے۔اس لئے وہ موت کو وجہِ تسکینِ قلب اور باعث قرار جاں قرار دیتے ہیں ۔

موت ہے یا خدا کے کارندے
لے کے میرا قرار آئے ہیں

جیسا کہ کہہ چکا ہوں، میں نے ارشد صاحب سے ملاقات کے اولین مرحلہ ہی میں محسوس کرلیا تھا کہ اُن کے آئینۂ قلب پر تصوف کا نور عکس ریز ہے۔پھر آستانۂ مخدوم اشرف سمنانی کے روحانی وعرفانی ماحول میں رہ کر کیسے ممکن تھا کہ اُن کی شاعری کا دامن معارف سلوک کے جواہر سے خالی رہ جاتا؟!اگر شاعر صوفی مزاج ہے تو دنیا جہان کی ہزار داستانیں بیان کرنے کے بعد اپنے مرکز اصلی کی طرف ضرور لوٹے گا کہ یہی اس کے لئے سامان تسکین اور وجہِ افتخار ہے۔ارشد صاحب کے اشعار میں بھی ہمیں جا بہ جا عرفان و سلوک کی تجلیاں جلوہ گر نظر آتی ہیں۔ یہاں ان اشعار میں بیان کردہ حقائق ومعارف کی توضیح وتشریح کی گنجائش نہیں ہے،اس لئے صرف اشعار پیش کرنے پر اکتفا کر رہا ہوں۔

جلوۂ یار ہوا بے پردہ
کچھ نہیں دیکھا مگر دیکھا ہے

اور میں بھول گیا ہوں خود کو
ہاں فقط ایک نظر دیکھا ہے

جو ذرے ذرے میں دیکھا گیا ہے اے ارشدؔ
مری نگاہ سے پھر بھی چھپا ہوا ہے وہ

کوئی پردے کے پیچھے بولتا ہے
کوئی برپا ہے میرے جسم و جاں تک

میں کیا دیکھوں کہ غش ہی آ گیا تھا
وہ بے پردہ ہوا مجھ پر یہاں تک

مری حیات میں رنگ جمال تھا اُس کا
وہ بے نیاز تھا پھر بھی کمال تھا اُس کا

نکل گیا ہوں زمان و مکان کی حد سے
مرے وجود پہ طاری جو حال تھا اُس کا

ذرے ذرے میں جلوہ اُسی ایک کا
میں نے دیکھا مگر کچھ بھی دیکھا نہ تھا

ایسے جلوے کس لئے تابِ نظر سے پیشتر
اتنے پردے کس لئے ہیں جلوہ آرائی کے بعد

محسوس ہورہا تھا کوئی پاس ہی مرے
کھڑکی کھلی نہ تھی کوئی اندر چھپا نہ تھا

نہ کہہ کہ ڈھونڈھ ہمیں چار سو زمانے میں
مجھے کہیں نہیں ملتا ہے تو زمانے میں

سنا ہے وہ رگِ جاں سے بھی ہے نزدیک تر لوگو!
تو پھر کیا ہے کہ اپنا حسن بے پردہ نہیں کرتا

مرے ہی کاندھے نے وہ بوجھ اٹھالیا ارشدؔ
خدائی بھر میں جسے کوئی بھی اٹھا نہ سکا

ارادے ٹوٹ جاتے ہیں بہت سے موڑ پر ارشدؔ
مرے اندر کوئی میری مشیت کے سوا بھی ہے

کہیں ذرہ ، کہیں سورج ، وہی ایک
پرندے کی چہک ، گل کی مہک ہے
فرشتے رہ گئے تسبیح پڑھتے
رسائی آدمی کی عرش تک ہے

تصوف کی روح یہ ہے کہ انسان کی تمام تمناؤں اور آرزوؤں کا مطاف صرف رضائے الٰہی ہو جسے قرآن حکیم کی اصطلاح میں ''ابتغاء وجہ اللہ'' کہا گیا ہے۔اس لئے صوفیاء کرام کے مجاہدات ومراقبات اور عبادات وریاضیات کا مطلوب نہ دنیا کی راحت ہوتی ہے نہ عقبیٰ کا عیش وعشرت، نہ حور وغلماں اور نہ نعمتہائے بہشت، بلکہ ان کا منتہائے مقصود صرف خوشنودی ربانی ہوتا ہے۔ارشد صاحب تصوف کی اس روحانی حقیقت سے اچھی طرح واقف ہیں۔اِس لئے بار بار اعلان کرتے ہیں۔

مجھ کو دنیا کی نعمت نہیں چاہئے ،مجھ کو رضواں کی جنت نہیں چاہئے
ان کی نظروں کے مرکز میں پہنچا ہوں میں اور میری طبیعت سنبھلنے لگی

صبر کی وادیوں میں میں چلتا رہا ، آبلے پھوڑ کر آگے بڑھتا رہا
ان کی مرضی ملی بس یہی سوچ کر زخم جتنے تھے سب مسکراتے رہے

کوچۂ یار میں ہے مری زندگی ،دین و دنیا کی ہیں ساری خوشیاں وہیں
میں نے ارشدؔ کسی کی بھی اک نہ سنی لوگ جنت کا رستہ بتاتے رہے

مجھے اُن کی خوشی کا ایک کونا مل گیا ہوتا
تو پھر کیا ہے اگر تقسیم جنت ہونے والی ہے

تمھارے چاہنے والے نے جنت کی نہیں سوچی
تمھاری یاد کا مارا غم دنیا نہیں کرتا

مجھے امید ہے کہ ادبی دنیا میں اس ہمہ رنگ مجموعۂ غزلیات کو حسن قبول حاصل ہوگا اور شاعر کی ندرتِ فکر چمنستانِ سخن میں نئے نئے لالۂ و گل کھلاتی رہے گی ۔ ذہنوں کو پاکیزہ نظریات کی خوشبو سے مہکاتی رہے گی اور فضائے حیات کو اپنے دلکش اشعار سے نغمہ زار بناتی رہے گی اور شاعر کی تہہ دار شخصیت کی تہیں کھلتی رہیں گی، کھلتی رہیں گی، کھلتی رہیں گی۔

نصیر سراجی

شاعری: انسانی ثقافت کا گرانقدر تحفہ

انور جمال (ایم ایس سی)

سابق سب اڈیٹر روزنامہ قومی مورچہ، بنارس

شاعری کے ذریعہ انسانی احساسات و کیفیات کی جس قدر تشریح ممکن ہوسکی ہے اور ہر کس و ناکس کو اس سے انسانی مزاج کو سمجھنے میں جو سہولتیں پیدا ہوئی ہیں اور پھر اکثر و بیشتر سماج کو کوئی رُخ دینے میں شاعری کا جو کردار رہا ہے، یہ سب قابل قدر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کی ہر زبان نے شاعری کو اپنے تہذیبی ورثے کا درجہ دے کر اس کی آبیاری کی ہے اور اس کے فروغ کے جتن کئے ہیں۔ شاعری اپنے عہد کی ترجمان ہوتی ہے اور ہر دور میں اس کا رنگ ڈھنگ جداگانہ ہوتا ہے۔

شاعری کتنی ہی اچھی کیوں نہ ہو بغیر تبدیلی کے زمانے کے ساتھ نہیں چل سکتی، اِس لئے کہ زمانہ خود تغیر پذیر ہے۔ اردو شاعری نے بھی عہد بہ عہد نہ جانے کتنے روپ اختیار کئے اور عوام و خواص میں اپنی مقبولیت و پسندیدگی کو کم نہ ہونے دیا۔ اردو شاعری میں جہاں میر و غالب جیسے لازوال شاعروں کے نام آتے ہیں اور ان کی شاعری کو سدابہار شاعری کی حیثیت سے یاد کیا جاتا ہے، لیکن شاید ہی کوئی یہ کہے کہ ایسے اساتذۂ فن کے بعد اب شاعری کی کیا ضرورت ہے، باتیں تو سبھی کہی جاچکی ہیں اور اب آگے کون آئے گا جو وہی باتیں اُن سے بہتر ڈھنگ سے کہہ پانے کا دعویٰ کر سکے گا؟

سچ تو یہ ہے کہ میر و غالب اور انیس و اقبال سے لے کر فراق و فیض تک اور پھر اس کے بعد اور بھی کتنے ہی ایسے نام گنائے جاسکتے ہیں جنھوں نے زندگی بھر اردو شاعری کے گیسو سنوارے اور اپنے اشعار کی بدولت عوام کے دلوں میں جگہ بنانے میں کامیاب ہوئے اور شاید کہ رہتی دنیا تک بحیثیت شاعر زندہ رہیں گے۔ ان کی شاعری کی اہمیت کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ ان میں سے کسی ایک کو بھی اگر علیٰحدہ کرلیا جائے تو پوری اردو شاعری

ادھوری سمجھی جائے گی۔

شاعر چھوٹا ہو یا بڑا کوئی بھی غیر اہم نہیں اور کون جانے چھوٹا سمجھا جانے والا ایک شاعر کب کتنا عظیم شعر کہہ لے۔

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

مومن کا یہ شعر سن کر غالب نے کہا تھا کہ: مومن! تم اس شعر کے بدلے میرا دیوان لے لو۔

بشیر بدر ہزار مطعون ہونے کے باوجود اس عہد کے تمام چھوٹے بڑے شاعروں کو کسی نہ کسی طور پر متاثر کرنے میں کامیاب رہے ہیں۔ میرے خیال میں شاعری درونِ دل سے پھوٹا ہوا وہ نغمہ ہے جو انسان کو شعور وآگہی کی اعلیٰ منازل تک لے جاتا ہے اور اسے احساسات و جذبات کی لطافتوں سے ہمکنار کرتا ہے۔ دل میں طہارت، محبت اور صلح کی فطری خصوصیات اگر مر نہیں چکی ہیں تو ایک شعر بھی زندگی کی کسی پیچیدہ گتھی کو سلجھانے اور ہدایت بہم پہنچانے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے۔

شعر کی تعریف میں میرے ان کلمات کا یہ مطلب ہرگز نہیں لیا جانا چاہیئے کہ خدانخواستہ میں انہیں فرمان الٰہی، قرآن وحدیث کے مساوی قرار دینا چاہتا ہوں۔ اشعار بہر حال تخئیلی ہوتے ہیں اور ان میں اندیشہ ہائے دور دراز کا پورا امکان پایا جاتا ہے۔ ان سے نفع ونقصان حاصل کرنے کا تمام تر دارو مدار آپ کی افتادِ طبع پر ہے، لیکن صرف اس امکان سے شاعری کی تعمیری صفات سے انکار تو نہیں کیا جا سکتا۔

تاریخ گواہ ہے کہ ہمیں انسانی تہذیب وتمدن کے جتنے پرانے آثار ملتے ہیں، ہر جگہ شعر وشاعری کی اثر آفرینی کے ثبوت بھی ملتے ہیں۔ بالفاظ دیگر شعر وشاعری نے انسانی تہذیب کو ہر عہد اور ہر دور میں خاطر خواہ طور پر متاثر کیا ہے۔ شعر وشاعری کے بل پر انسانوں نے جنگیں جیتی ہیں۔ حکومتیں تبدیل کی ہیں۔ امن وامان اور میل ملاپ کو فروغ دیا ہے۔ مذہبی غیرت وحمیت کو بیدار کیا ہے اور رسم ورواج کو نہ صرف فروغ بلکہ زندہ بھی رکھا ہے۔

تیرہویں صدی میں چین کے ایک ظالم حکمراں نے اپنے ملک میں شاعری پر صرف اس لئے پابندی عائد کردی تھی کہ اسے خوف لاحق ہوگیا تھا کہ شعرا اپنے شعلہ بار اشعار سے عوام کے اندر اس کی حکومت کے خلاف بغاوت کی لہر پھونک دیں گے۔ ہزاروں شعرا جرم شاعری کی پاداش میں تہ تیغ کر دیئے گئے، لیکن ان کے اشعار بالآخر انقلاب برپا کر کے رہے اور ظالم حکمراں کو تخت سے برطرف ہونا پڑا۔

عہد جدید میں اگر بھارت کی مثال سامنے رکھیں تو یہاں زندگی کے ہر شعبے میں اردو شاعری کا بول بالا رہا ہے۔ حسن و عشق کے راز و نیاز سے لے کر اسلامی فلسفۂ حیات کی تعلیم و ترویج اور پھر جنگ آزادی کی تحریک تک کے سارے انقلابی مشن اردو شاعری کے بینر تلے انجام پاتے رہے ہیں۔

ارشد جمال اشرفی کی شاعری کے چند دلنواز پہلو

جناب ارشد جمال اشرفی بحیثیت عالم دین کے جس قدر مشہور و معروف ہیں بحیثیت شاعر اسی قدر پوشیدہ اور پُر اسرار ہیں۔ میں نے جب پہلے پہل اُن کے چند اشعار سنے تو اپنی اس رائے کا اظہار کیئے بغیر نہ رہ سکا کہ اُن کے یہاں مضامین کے انتخاب میں جہاں ایک عجیب سی ندرت ہے، وہیں طرز بیان میں زبردست بے باکی ہے۔ حالانکہ نئے موضوعات کو شاعری میں برتنے کی جرأت پھر ساتھ میں سلیقہ مندی بھی کم ہی شاعروں کے حصے میں آئی ہے۔ اگر چہ ماضی کی بہ نسبت حال کے شعرا میں نئے موضوعات کے تئیں میلان برابر بڑھتا جا رہا ہے اور اس عمل میں اکثر و بیشتر اُنہیں توازن اور متانت سے بھی ہاتھ دھونا پڑتا ہے۔ نت نئے تجربے مواصلات کی راہ میں ایسی سنگین اڑچنیں اور رکاوٹیں پیدا کرتے ہیں کہ بسا اوقات سارا ماحول ہی انتہائی غیر سنجیدہ ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے میں موضوع کی نوآفرینی اپنے آپ میں ایک اُضحوکہ بن جاتی ہے، چہ جائے کہ وہ اہل ذوق کو انسانی احساسات و کیفیات کے نئے زاویوں سے روشناس کرائے، مگر مجھے اس اعتراف

میں کوئی دریغ نہیں کہ ارشد جمال اشرفی نے شاعری کے مختلف عناصر کو اس ہنرمندی سے بیک وقت برتا ہے کہ ہم بلا تکلف شاعری کے اجنبی حدود میں داخل ہو کر ایک نئے ادراک سے بہرہ ور ہوتے ہیں۔ مثلاً ؂

چیختی زندگی سے میں بہرا ہوا
درد بھی چپ ہوا چوٹ بھی سوگئی

پردیس میں بیگانوں کے گھر پائی ہے عزت
بیگانہ ہوا جاتا ہوں میں اپنے وطن میں

مرے ہاتھ کا یہ کمال تھا کہ کسی کا عہد زوال تھا
جو کھرے تھے وہ تو کھرے رہے مرے کھوٹے سکے بھی چل گئے

میں اپنے بند کمرے میں پڑا ہوں
زمانے سے تعارف بولتا ہے

میں اس سے بھاگتا پھرتا ہوں اک زمانے سے
مرے نصیب میں شاید لکھا ہوا ہے وہ

ارشد جمال اشرفی نے ترقی یافتہ دور کی تمام تر آسائشوں کے درمیان رہ رہ کر اٹھنے والی ٹیس کو شدت سے محسوس کیا ہے ؂

میں ارشدؔ زندگی کی جنتوں میں ہوں، مگر پھر بھی
مرے پہلو میں کوئی چیز رہ رہ کر کھٹکتی ہے

قہقہوں اور خوش گپیوں کے پیچھے بیتاب روحوں کی چیخ سنتے رہے ہیں ؂

خوشنما چہرے کے پردے میں تھی زخمی تصویر
میں نے کیا کیا اسے سمجھا تھا وہ کیسا نکلا

اور آنکھوں کو خیرہ کردینے والی روشنیوں کے اُس پار کا منظر بھی اُن کی آنکھوں میں ہے۔

محلوں کے اجالوں میں مرا رنگ ہوا زرد
پودے تو ہرے ہوتے ہیں سورج کی کرن میں

لیکن اتنا کچھ دیکھنے کے بعد بھی احساسات مردہ نہیں ہوئے اور شاعر کا شعور پہلے سے کہیں زیادہ Senstive ہے۔

آنکھوں کی خشک ریت سے دریا اُبل پڑا
وہ بوجھ درد کا ہے کہ دل ڈوبنے لگا

جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں کہ مولانا ارشد جمال اشرفی دینی علوم کے قافلہ سالار ہیں اور دینی شعار اُن کا شیوہ اور دینی فلسفہ اُن کی فکر پر محیط ہے۔ انھوں نے شاعری میں قدم رکھا تو اپنی جلو میں بہت سے چاند ستارے اقلیم دین سے جیسے از خود درآئے ہوں، مگر اتنی آہستگی سے کہ خارجیت کا کوئی نام نشان نہیں ملتا۔ ملاحظہ ہوں اُن کے یہ شعر۔

ایسے جلوے کس لئے تاب نظر سے پیشتر
اتنے پردے کس لئے ہیں جلوہ آرائی کے بعد

جاگنا تھا پہ جاگے تو مرنے کے بعد
عمر بھر ہم کھلی آنکھ سوتے رہے

یہ موت زندگی کی حقیقت کی شرح ہے
پردہ گرا تو سامنے تصویر کھل گئی

موصوف کی شاعری میں قلندرانہ شان عیاں ہے۔ یہاں

مرے نصیب میں طالع نگار نے لکھا
یہ کج کلاہ خدامست و بے نوا ہوگا

کے مطابق استغنا قسمت کا فیصلہ نہیں، بلکہ حقیقت آشکارا ہو جانے کے بعد ترجیحی طور پر مقصود و مطلوب ہے۔

بند بھی کرلو چاہے دنیا اپنی دونوں مٹھی میں
خالی ہاتھ تم آئے تھے اور خالی ہاتھ ہی جاؤ گے

اُس کو فٹ پاتھ پہ آرام کی نیند آتی ہے
ہم نے بستر پہ بھی سکھ چین گنوا رکھا ہے

اُس کی آنکھیں تجوری کو تکتی رہیں
چین سے سوگئی مفلسی رات میں

مجھ کو کافی ہے مری ماں کا پھٹا آنچل ہی
دوسرے سر پہ خدا ! تاجِ سکندر رکھنا

ایسے اشعار کی بھی کوئی کمی نہیں جہاں بالکل جدید اسلوب اختیار کرتے ہوئے عہد کی سفاکیوں کو بڑی معصومیت مگر بھرپور اثر آفرینی کے ساتھ صرف قلمبند ہی نہیں کیا گیا بلکہ ایک بامعنی پیغام بھی دیا گیا ہے۔

جینے کی ایک بچے نے کھائی قسم وہاں
جب اُس کے خاندان میں کوئی بچا نہ تھا

مرا سچ بیچ چوراہے پہ ننگا ہوگیا کیونکہ
ترے حق میں فقیہ شہر کی روشن گواہی تھی

لیکن ارشد جمال اشرفی کا بھی سرمایہ وہی لازوال شے ہے جسے اہل دل عشق کہتے ہیں۔

سلگتے ہونٹ ، نور اَفزا تبسم ، آتشیں رخسار
اندھیری رات میں یہ سب اجالے یاد آتے ہیں

انور جمال



یہ سب کیا ہے زمیں سے آسماں تک
کوئی سمجھے تو سمجھے بھی کہاں تک

لغت کی عقل سکتے میں پڑی ہے
ہوئی ہے چپ تصور کی زباں تک

کوئی پردے کے پیچھے بولتا ہے
کوئی برپا ہے میرے جسم و جاں تک

جمالِ زندگی مہمانِ دنیا
بہاروں کی ہنسی دورِ خزاں تک

میں کیا دیکھوں کہ غش ہی آ گیا تھا
وہ بے پردہ ہوا مجھ پر یہاں تک

پہنچ ارشدؔ کی ہوگی اب خدا تک
کہ پہنچا ہے نبی کے آستاں تک



پھر وہی اُن سے امیدیں شامِ تنہائی کے بعد
حوصلے کچھ اور بڑھ جاتے ہیں رسوائی کے بعد

ایسے جلوے کس لئے تابِ نظر سے پیشتر
اتنے پردے کس لئے ہیں جلوہ آرائی کے بعد

پھر وہی شبنم کا مٹنا پرتوِ خورشید سے
پھر وہی دورِ خزاں گلشن کی رعنائی کے بعد

اور بھی محتاط تدبیروں کے ساتھ آیا ہے وہ
میں نے سمجھا تھا کہ مر جائے گا پسپائی کے بعد

اب مجھے پرخار راہوں کا کوئی کھٹکا نہیں
تیز رَو میں ہوگیا ہوں آبلہ پائی کے بعد

آئے دن بننا بگڑنا زندگی کی ریت ہے
گھر میں پھر بجنے لگی زنجیر شہنائی کے بعد

میں روایت کی ڈگر پر چل نہ پایا ساتھ ساتھ
کٹ گئے سب مجھ سے برسوں کی شناسائی کے بعد

وہ امیر شہر تھا تو امن قائم تھا یہاں
فتنے جاگ اٹھے سب ارشدؔ کی پذیرائی کے بعد



جس غم کو میں نے پالا لہو چوسنے لگا
دل کے چھپے خزانے کو وہ لوٹنے لگا

مرنے کے بعد اُس کو حقیقت مری ملی
بے ساختہ وہ خاک مری چومنے لگا

اتنا ہوا کہ کمرے میں وہ مسکرا پڑا
دیوار و در سے نور سا کچھ پھوٹنے لگا

یہ موت کا سفر ہے محبت کی راہ میں
ہمت جواب دے گئی دَم پھولنے لگا

آنکھوں کی خشک ریت سے دریا ابل پڑا
وہ بوجھ درد کا ہے کہ دل ڈوبنے لگا

شب بھر خیال اُس کی طرف دوڑتا رہا
بستر سے میں اٹھا تو بدن ٹوٹنے لگا

تم نے بھی بند کر لئے دل کے تمام در
میں بھی تمھارا درد ذرا بھولنے لگا

یعنی کہ راس آ نہ سکی اُس کو یہ بہار
بوڑھا درخت اب کے برس سوکھنے لگا

ہوتے ہیں بدگماں کہ شکایت مری ہوئی
ارشدؔ کبھی کسی سے جو کچھ پوچھنے لگا



میں زخم زخم تھا منہ سے مگر بتا نہ سکا
عجیب حال تھا دل کھول کر دکھا نہ سکا

تمام عمر مری احتیاط میں گذری
میں اپنے آپ کو خود سے مگر بچا نہ سکا

وہ ایک دریا جو سیراب سب کو کرتا تھا
سلگتی آگ مرے پیٹ کی بجھا نہ سکا

زمانہ ساز طبیعت تھی اُس منافق کی
وہ روز ہاتھ ملاتا تھا ، دل ملا نہ سکا

وہ اجنبی کی طرح میرے پاس سے گذرا
یہ شرم میں بھی زمانے سے اب چھپا نہ سکا

وہ جس کو سوچ کے میں چور چور ہوتا ہوں
اُسی کو یہ مرا کمبخت دل بھلا نہ سکا

مرے ہی کاندھوں نے وہ بوجھ اٹھالیا ارشدؔ
خدائی بھر میں جسے کوئی بھی اٹھا نہ سکا



مرے سورج کے آگے سب ستارے ڈوب جاتے ہیں
اکیلی رات کے دکھ درد سارے ڈوب جاتے ہیں

ابھر کر سیکڑوں رشتے نکل آتے ہیں خوشیوں میں
غم آنے پر بڑے اچھے سہارے ڈوب جاتے ہیں

کہیں دریا کی خاموشی سے تم دھوکا نہ کھا جانا
سنا ہے تیرنے والے کنارے ڈوب جاتے ہیں

ٹھٹھر جاتی ہیں برفیلی ہواؤں سے چٹانیں بھی
اگر ہو دھند گہری تو منارے ڈوب جاتے ہیں

میں شاید خواب کے دریا کی اب تک سیر کرتا ہوں
مری آنکھوں کے کھلنے سے نظارے ڈوب جاتے ہیں

یہ کس کی یاد سیلابِ بلا بن کر اُمڈتی ہے
کہ بس بیٹھے ہی بیٹھے دل ہمارے ڈوب جاتے ہیں

نکل آتا ہے ارشدؔ تیر کر دشتِ قناعت سے
سرابوں میں بھی کچھ لالچ کے مارے ڈوب جاتے ہیں



مری حیات میں رنگ جمال تھا اُس کا
وہ بے نیاز تھا پھر بھی ، کمال تھا اُس کا

وہ آفتابِ زمانہ ضرور تھا لیکن
بلندیوں پہ پہنچ کر زوال تھا اُس کا

شکار دونوں ہی حالات کے ہوئے تھے مگر
مجھے تو فکر نہیں تھی ، سوال تھا اُس کا

پرانے ذہنوں میں شاید کہ انقلاب آئے
اندھیرے جسم میں روشن خیال تھا اُس کا

نکل گیا ہوں زمان و مکان کی حد سے
مرے وجود پہ طاری جو حال تھا اُس کا

زمانوں بعد بھی آتا ہے یاد رہ رہ کر
چھپا ہوا کہیں دل میں ملال تھا اُس کا

اُسے چھڑانے میں ارشدؔ بھی ہو گیا مجرم
گنہ میں ڈوبا ہوا بال بال تھا اُس کا



نہ یہ روشنی رہے گی ، نہ یہ دلکشی رہے گی
تم اگر نہیں تو دنیا میں بڑی کمی رہے گی

مرا نفس میرا دشمن ، مری فکر مجھ سے باغی
نہ کوئی وفا کرے گا ، نہ یہ دوستی رہے گی

مرے اور بھی فرائض ہیں زمین و آسماں میں
تری یاد میرے دل میں گھڑی دو گھڑی رہے گی

کوئی چاند اور ستاروں سے ہزار جگمگائے
جو اداس سر زمیں ہے وہ اداس ہی رہے گی

میں اگرچہ شورِ دنیا سے خموش ہو گیا ہوں
تری بات پھر بھی ہونٹوں پہ کبھی کبھی رہے گی

یہ کرائے کا مکاں ہے، یہ پرائی زندگی ہے
میں ہوں خود پہ قرض ارشدؔ مجھے کیا خوشی رہے گی



تنگ ظرفوں کے لئے دریا دلی اچھی نہیں
بے حسی کے موڑ پر یہ آگہی اچھی نہیں

پھونکنے آئے ہیں میرا دردمندی کا چراغ
یعنی اندھوں کے لئے یہ روشنی اچھی نہیں

ٹوٹ کر ورنہ بکھر جائے گا چھوٹا سا وجود
بلبلو! دریا میں رہ کر خودسری اچھی نہیں

اُس نے دیکھا جب سے مجھ کو دیکھتے ہیں سب مجھے
آئینہ بکتا رہا صورت مری اچھی نہیں

کچھ نہ کچھ ہنگامہ آرائی کئے جاؤ ضرور
خالی خالی سونی سونی زندگی اچھی نہیں

وقت بدلا، فکر بدلی، اب تقاضے اور ہیں
چھوڑ ارشدؔ وہ پرانی شاعری اچھی نہیں



مختار جتنے لوگ تھے مجبور ہو گئے
احباب دیکھ سن کے یہ مسرور ہو گئے

جب اُن سے دور تھے تو تمنائے قرب تھی
آخر قریب ہو کے بہت دور ہو گئے

معلوم اب ہوا کہ وہ پتھر نگاہ تھا
شیشے مری وفاؤں کے سب چور ہو گئے

چھوٹے سے گھر میں تھیں ہمیں آزادیاں نصیب
آ کر کشادہ محلوں میں محصور ہو گئے

صحرائے رنج ہے ابھی راہ حیات میں
تم تھوڑی دور چل کے ہی رنجور ہو گئے

اب میری کالی رات میں اُگتے ہیں آفتاب
جو نور بانٹتے تھے وہ بے نور ہو گئے

جو زندگی کی دوڑ میں رہتے تھے پیش پیش
ارشدؔ میں دیکھتا ہوں کہ معذور ہو گئے



جاگ اٹھی ہر طرف روشنی رات میں
میں اکیلا رہا اجنبی رات میں

اُس کی آنکھیں تجوری کو تکتی رہیں
چین سے سوگئی مفلسی رات میں

آمدِ صبح کے منتظر کیوں رہیں
ہم اُگائیں گے سورج اِسی رات میں

جبر کی ظلمتوں سے میں لڑتا رہا
ہار کر کیوں کروں خودکشی رات میں

دن دہاڑے مجھے لوٹ کر لے گیا
پھر اُسے کیوں رہی بے کلی رات میں

تم تو ارشدؔ پڑے سو رہے تھے کہیں
بٹ رہی تھی غضب کی خوشی رات میں



جب تلک بھڑکے نہ شعلہ روشنی ہوتی نہیں
دکھ نہ ہو تو زندگی پھر زندگی ہوتی نہیں

سیکڑوں منظر مجھے روتے ہوئے آئے نظر
اب مری آنکھوں میں پہلی سی نمی ہوتی نہیں

اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کی دے توفیق، رب
ہم اَنا والے ہیں ہم سے نوکری ہوتی نہیں

میں تمھارے شوق میں پھرتا رہا ہوں اِس لئے
میرے پیچھے پیچھے اتنی بیکسی ہوتی نہیں

اُس نے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے دلِ بیچارہ کے
پھر بھی جذباتِ محبت میں کمی ہوتی نہیں

زہرِ درد وغم میں پیتا جا رہا ہوں پے بہ پے
سخت جاں اتنا ہوں، مجھ سے خودکشی ہوتی نہیں

اِس علاقے میں تعارف ہو رہا تھا سب غلط
ورنہ یہ آواز میری اجنبی ہوتی نہیں

چاند میری چھت سے آئے دن گذرتا ہے مگر
گھر کے آنگن میں کسی دن چاندنی ہوتی نہیں

بے ہنر، بے نام میں رہتا تو ارشدؔ ٹھیک تھا
مجھ سے اتنی آسماں کو دشمنی ہوتی نہیں



یاد کرو گے ، پچھتاؤ گے ، اپنے کیئے پر شرماؤ گے
میں تو دوبارہ پھر نہ ملوں گا، تم رو رو کے مر جاؤ گے

سات سمندر پار اُتر کر اپنی منزل آئے گی
ساتھیو! تھک کر بیٹھو گے تو بیٹھے ہی رہ جاؤ گے

بہکی باتیں ، بھیگی آنکھیں سارا زمانہ دیکھے ہے
کتنی صفائی پیش کرو گے ، کتنی قسمیں کھاؤ گے

بند بھی کر لو چاہے دنیا اپنی دونوں مٹھی میں
خالی ہاتھ تم آئے تھے اور خالی ہاتھ ہی جاؤ گے

آئینہ خانے کا اک پتھر سینہ تانے کہتا ہے
ٹکڑے ٹکڑے ہو جاؤ گے ، ہم سے اگر ٹکراؤ گے

دور کے ڈھول سہانے ہیں، وہ نقلی چہرے والے ہیں
مجھ کو ٹھکرا کر جاتے ہو، ٹھیک ہے جاؤ، پچھتاؤ گے

آنکھیں پتھر، دل بھی پتھر، پتھریلے ماحول کے تم
میرے شیشے کے گلشن پر پتھر ہی برساؤ گے

چہرے مہرے سب اِک جیسے اور لب و لہجہ یکساں
کس سے تم پرہیز کرو گے اور کسے اپناؤ گے

توپ طمنچوں کا جو منظر دیکھا ہے اِن بچوں نے
ارشدؔ کھیل کھلونے دے کر خاک اِنھیں بہلاؤ گے



زندگی کے دیے جلائے تو
شکر ہے ، آپ مسکرائے تو

کچھ تو ہوتا رہے تعلق میں
نہ ہنسائے مجھے رلائے تو

زندگی درد سے عبارت ہے
کیا ہوا تو نے دل دُکھائے تو

ڈوبنا ہے انا کے ساگر میں
بلبلا اپنا سر اٹھائے تو

پھر بھی دل میں وہی اندھیرا ہے
مدتوں نور میں نہائے تو

لیکن اُس کو ترس نہیں آیا
حال دل کے بہت سنائے تو

شوق اُس کا کہاں تلک ارشؔد
وہ بھی اپنا قدم بڑھائے تو



تم نے اک بات پہ ہنگامہ اٹھا رکھا ہے
سب پتہ ہے یہ جو منصوبہ بنا رکھا ہے

میں کہاں دیتا بھلا پھول سے کانٹوں کا جواب
یہ طریقہ مرے پُرکھوں نے بنا رکھا ہے

اپنی اوقات میں رہتا ہوں مجھے چھوڑ بھی دے
اے ہوا! میں نے دِیا گھر میں جلا رکھا ہے

وقت نے چھین لیا سارا اَثاثہ میرا
اک اَنا ہے جسے مشکل سے بچا رکھا ہے

تیری دہلیز پہ نظروں کی ہے دستک کب سے
تو نے اے دوست! مگر پردہ گرا رکھا ہے

اب حویلی سے نکل کر مرے ٹوٹے گھر میں
زندگی! تو نے یہ کیا بھیس بنا رکھا ہے

اُس کو فٹ پاتھ پہ آرام کی نیند آتی ہے
ہم نے بستر پہ بھی سکھ چین گنوا رکھا ہے

وہ سمجھتے ہیں کہ اندر سے ہوں خالی لیکن
اپنے احساس کو چہرے سے چھپا رکھا ہے

دیکھئے پھٹ نہ پڑے بھیڑ میں ، اللہ حافظ!
اک اَلاؤ ہے جسے کب سے دبا رکھا ہے

تم نے ارشؔد کو کبھی جھانک کے دیکھا ہی نہیں
میں نے برسوں سے یہ دروازہ کھلا رکھا ہے



درد صدیوں کا الٰہی! مرے اندر رکھنا
میں نے سیکھا ہی نہیں زیست کو بہتر رکھنا

دھوپ نے جس کو پنھائی تھی سنہری پوشاک
اُس کی میت پہ کہاں پھولوں کی چادر رکھنا

تیرا بادل کسی ویرانے میں جا کر برسا
سوکھے ہونٹوں کا خیال اب کے سمندر رکھنا

مجھ کو کافی ہے مری ماں کا پھٹا آنچل ہی
دوسرے سر پہ خدا ! تاج سکندر رکھنا

تمھیں معلوم نہیں پیار کے دشمن ہیں بہت
میرے سینے پہ ہتھیلی نہیں پتھر رکھنا

زندگی آج تو خوشیوں میں نہا جائے گی
میرے کاندھے پہ ترا روتے ہوئے سر رکھنا

میں تمھیں پھول کے ریزے بھی نہیں لاسکتا
میرے اشکوں سے ہی تم مانگ سجا کر رکھنا

نئی تہذیب کے بازار میں قیمت ہی نہیں
اپنے اجداد کی میراث ابھی گھر رکھنا

دل کسی اور ہی مطلب کا ہے ارشدؔ صاحب
بوجھ جو کچھ ہے اُسے اپنے بدن پر رکھنا



ہم ہیں دکھ کے مارے لوگ
دور ہیں اپنے پیارے لوگ

مجھ کو قبر میں دفنانے
آئے اتنے سارے لوگ

گاؤں کی عزت اِن کی رَکھیل
یہ ہیں راج دلارے لوگ

چارہ گرانِ عالم ہیں
گھر کے یہ بیچارے لوگ

فاتح خود کو سمجھتے ہیں
عشق کی بازی ہارے لوگ

من کی کالی راتوں میں
نکلے چاند ستارے لوگ

کب سے کھڑے ہیں پیاسے ہی
ہم دریا کے کنارے لوگ

کانچ کے ٹکڑے روشن ہیں
اور اندھے مہ پارے لوگ

مسند و منبر پر قابض
ہیں اکثر آوارے لوگ

ارشدؔ دنیا ایک پڑاؤ
اور ہم سب بنجارے لوگ



لوٹنے دل کو مرے درد کا لشکر آیا
کیا یہاں رکھا ہے؟ خیر آیا تو بہتر آیا

ایک ہنگامہ سا آہوں کا مچا تھا کل رات
چور دروازے سے کوئی مرے اندر آیا

کس ہنرمندی سے پھولوں کا ہوا بٹوارہ
میرے حصے میں وہی باغ کا پتھر آیا

دندناتے ہوئے پھرتے ہیں ہزاروں یاجوج
اے خدا! پھر نہ کوئی اور سکندر آیا

کسی ویرانے کی تقدیر تھی چہرے پہ لکھی
وہ مرے سامنے منہ پھیر کے اکثر آیا

میں نے پیغامِ وفا لکھا تھا اُس کو ارشدؔ
خون آنکھوں میں لئے میرا کبوتر آیا



مرے گال پر ترا نام ہے مرے آنسووں سے لکھا ہوا
مری آنکھ کچھ ہے رنگی ہوئی ، مرا دل ہے تھوڑا بجھا ہوا

مرے دل کا حال عجب ہوا ، کئی بار یہ تو لُٹا پٹا
یہاں کون آئے گا اب بھلا، یہ کھنڈر ہے خالی پڑا ہوا

وہ مجھے خرید کے کھا گیا ، کوئی اُس کا منہ نہیں دیکھتا
مرے بال نوچ رہے ہیں سب : یہ ہے بے ضمیر، بکا ہوا

وہ کسی غریب کی بھول تھی ، جو سڑک پہ ننگی کھڑی رہی
یہ امیر زادے کا جرم ہے ، کئی عزتوں میں چھپا ہوا

میں وفا کی رسم سمجھ گیا ، مجھے مت رِجھا ، مجھے مت بلا
مرے دوست جا،مرے دوست جا!اِسی بل کا میں ہوں ڈسا ہوا

مرا عزم تو ہے جواں مگر ، مری فکر تو ہے رواں مگر
مرا ہاتھ بھی ہے دبا ہوا ، مرا ذہن بھی ہے تھکا ہوا

وہ خلا میں تیر کے آ گئے ، اُنھیں جنتوں کی تلاش ہے
میں ہوں اپنے پیٹ کی آگ میں ابھی خاک ہی پہ پڑا ہوا

مرے دوستوں کی یہ بھیڑ ہے، جو ہر ایک موڑ پہ ساتھ ہے
میں اکیلا تھا تو سکون تھا۔ ہوں اذیتوں میں پھنسا ہوا

مری ارشدؔ اُس سے کہاں نبھے ، میں دلیل و فکر کا آدمی
وہ روایتوں پہ اَڑا ہوا ، وہ توہّموں پہ ڈٹا ہوا



وعدہ کرتے ہیں پر نہیں آتے
ہم بھی تو بات پر نہیں آتے

موجِ دریا نے پرورش کی ہے
یوں صدف میں گہر نہیں آتے

پہلے آتے تھے خیر مقدم کو
اب وہ دیوار و در نہیں آتے

ہوش و دل آج ایک عرصے سے
لے کے میری خبر نہیں آتے

جن پہ قسمت کا فیصلہ ٹھہرا
وہ ستارے نظر نہیں آتے

اپنے حالات آج ٹھیک نہیں
دوست احباب گھر نہیں آتے

حق ہی شاید کہ اٹھ گیا ارشدؔ
جب تو نیزوں پہ سَر نہیں آتے



اپنے افکار کے سائے سے بھی ڈر لگتا ہے
زندگی! تجھ پہ محبت کا اثر لگتا ہے

جانے تم کیا ہو کہ اک بار تمھیں یاد کیا
یہ مرا دل نہیں، آسیب کا گھر لگتا ہے

نہ تو ہونٹوں پہ تبسم نہ تو آنکھوں میں نمی
کون سا شہر ہے؟ پتھر کا نگر لگتا ہے

اُس کی تکلیف پہ رونا مجھے آجاتا ہے
وہ مرا کوئی نہیں، کچھ تو مگر لگتا ہے

میں نہیں جاتا وہاں میری غزل کا کیا کام
اُس شہنشاہ کا دربار اگر لگتا ہے

ہمیں بازار کا اندازہ نہیں ہے ارشدؔ
ہم ہنر والے اِدھر میلہ اُدھر لگتا ہے



ابھی اپنی تباہی کا نظارہ دیکھتا ہوں میں
ترقی کے منازل کا اشارہ دیکھتا ہوں میں

محبت مر نہیں سکتی زمانے کے حوادث سے
بھلے ہی اپنے دل کو پارہ پارہ دیکھتا ہوں

وہ اپنے زورِ بازو سے مسخّر کر چکے عالم
یہاں بیٹھا نگینہ اور ستارہ دیکھتا ہوں میں

مرے ٹوٹے منڈیروں پر کبوتر کیوں نہیں آتے
کہ اُس چھت پر بلندی کا منارہ دیکھتا ہوں میں

مجھے دریا کی لہروں کا بھروسا کچھ نہیں ارشؔد
جبھی کشتی سے مڑ مڑ کر کنارہ دیکھتا ہوں میں



جگہ دل میں بہت کچھ دردِ فرقت کے سوا بھی ہے
بہت سا کام دنیا میں محبت کے سوا بھی ہے

تمھارے سایۂ صحبت کی برکت سے ہوا معلوم
زمین عشرت و آرام جنت کے سوا بھی ہے

ارے مغرور سر ظالم ! مری کچھ بھی تو سنتا جا
یہاں اک داستانِ غم شکایت کے سوا بھی ہے

ہمارے دین میں تو دردمندی اصل ہے واعظ !
ترا دیں فتوئ کفر و ضلالت کے سوا بھی ہے

ادائے حسن سے بیزار دل پھر بھی پریشاں ہے
یقیناً کچھ نہ کچھ تجھ میں نزاکت کے سوا بھی ہے

ارادے ٹوٹ جاتے ہیں بہت سے موڑ پر ارشدؔ
مرے اندر کوئی میری مشیّت کے سوا بھی ہے



میں کیا بتاؤں مجھے اضطراب کتنا ہے
کہ زندگی کا حساب و کتاب کتنا ہے

مری نظر تمھیں ہر دم تلاش کرتی ہے
بھلا بتاؤ بھی مجھ سے حجاب کتنا ہے

غمِ حیات کے ساتھ اس کی بے وفائی بھی
مرے خدا! مری جاں پر عذاب کتنا ہے

ہمارا سچ سرِ بازار ہو گیا رسوا
وہ جھوٹ بول کے بھی کامیاب کتنا ہے

کہ اُس کے دست جفا کو تو میں نے چوم لیا
مری دلیل سے وہ لا جواب کتنا ہے

یہ دور وہ ہے کہ جنگل بھی ہو گئے آباد
اور ارشدؔ آج بھی خانہ خراب کتنا ہے



وہ ٹنڈ منڈ پیڑ ذرا بھی جھکا نہ تھا
کچھ رحم آندھیوں نے بھی اس پر کیا نہ تھا

سایہ سا آ رہا تھا مجھے جام میں نظر
کچھ یونہی میں نے شوق میں ہرگز پیا نہ تھا

میں آشنائے رازِ محبت ازل سے ہوں
جو اس کے دل کا حال تھا مجھ پر چھپا نہ تھا

ہیرے جواہرات کا تاجر تھا میرا دوست
اُس نے بدن کا میل بھی مجھ کو دیا نہ تھا

میں کر رہا تھا نامۂ اعمال کو سیاہ
مجھ کو مرے ضمیر نے کچھ بھی کہا نہ تھا

محسوس ہو رہا تھا کوئی پاس ہی مرے
کھڑکی کھلی نہ تھی، کوئی اندر چھپا نہ تھا

مجھ کو خبر نہ تھی کہ وہ گدڑی کا لعل ہے
ارشدؔ کسی کے ہاتھ پہ جب تک بکا نہ تھا



بے کلی اتنی نہ تھی ، آسودگی اتنی نہ تھی
لوگ جب اندھے نہ تھے تو روشنی اتنی نہ تھی

مجھ کو اپنا ہاتھ اُس کے ہاتھ میں دینا پڑا
زندگی جب کچھ نہ تھی تو بے بسی اتنی نہ تھی

کچھ شریفوں نے بھی گھر آ کر بسائے ہیں یہاں
اس محلے میں کبھی آوارگی اتنی نہ تھی

سیکڑوں سے پوچھ کر رستہ بھٹک کر رہ گیا
رہنما اتنے نہ تھے تو گمرہی اتنی نہ تھی

چند لمحوں کی خوشی لے کر وہ آیا ایک بار
پہلے ارشدؔ کی کہانی دکھ بھری اتنی نہ تھی



ابھری ہوئی لکیروں کو میں نے پڑھا نہ تھا
ایسا نہیں کہ ماتھے پہ کچھ بھی لکھا نہ تھا

ہم ایسے تیز رَو نہ تھے صحرائے زیست میں
جب تک ہمارے پاؤں میں کانٹا چبھا نہ تھا

روحوں کی سرزمین پہ جا کر بسے ہیں لوگ
بستی میں اک دھواں کے سوا کچھ بچا نہ تھا

جینے کی ایک بچے نے کھائی قسم وہاں
جب اُس کے خاندان میں کوئی بچا نہ تھا

گھر آگ آگ اور گلی چیختی ہوئی
ایسا تو سات پشتوں نے میری سنا نہ تھا

ماحول سازگار ہی ارشدؔ نہ مل سکا
میں زندہ دل تھا اورمرا جذبہ مَرا نہ تھا



نہ کہہ کہ ڈھونڈھ ہمیں چارسو زمانے میں
مجھے کہیں نہیں ملتا ہے تو زمانے میں

ٹھہر سکا نہ رگوں میں تو آنکھ سے اترا
ہمارے رنگ کا لاؤ لہو زمانے میں

یہ مفلسی کہ بکی ہے جنون کے بدلے
تمھارے ہاتھ مری آبرو زمانے میں

تری سی بات، تری سی ادا کہاں ہے پھر
جو مل بھی جائے ترا ہو بہو زمانے میں

وفا کا نام و نشاں دور تک نہیں ملتا
میں کر چکا ہوں بہت جستجو زمانے میں

مٹا بھی دیجئے اپنے خیال سے ارشدؔ
مگر رہے گی مری گفتگو زمانے میں



مجھ کو بدنام کریں آپ یہ اچھا تو نہیں
آزما لیتے محبت کوئی دھوکا تو نہیں

رنگ مایوسی ہے دیوار خوشی پر گھر میں
کہہ گئے: دیکھئے آ جائیں گے، وعدہ تو نہیں

دل دیا جان بھی دینے کے تقاضے ہوں گے
اجنبی سے مرا ایسا کوئی رشتہ تو نہیں

میرے آقاؤ! یہ کیا کھیل نکالا تم نے
میری عزت ہے یہ بچوں کا کھلونا تو نہیں

دردمندی کا گنہ ہو گیا مجھ سے آخر
کیا کروں صاحبِ دل تھا میں فرشتہ تو نہیں

گردشِ وقت کا ساتھی مجھے بننا ہی پڑا
میں نے دیکھا کہ مرے ساتھ زمانہ تو نہیں

ہم غمِ دل میں تو وہ لوگ غمِ دنیا میں
سب ہیں بیمار ، مکمل کوئی اچھا تو نہیں

وقت پر غیب سے آجائیں گے دست و بازو
یوں بظاہر کوئی ارشد کا سہارا تو نہیں



کہتے ہیں جلوۂ رخسار کہاں سے لاؤں
آہ ! میں طاقت دیدار کہاں سے لاؤں

پیش کرتا ہے مگر آئینہ کہتا ہے یہی
آپ سا روئے ضیا بار کہاں سے لاؤں

تھک کے بیٹھا تری یادوں کا سہارا لے کر
غم کے صحرا میں بھی دیوار کہاں سے لاؤں

سب بچھا ڈالے ہیں ظالم نے مری راہوں میں
ہاتھ ملتے ہیں کہ اب خار کہاں سے لاؤں

جتنے احباب تھے سب ہوگئے ناصح ارشدؔ
عشق آوارہ کا غمخوار کہاں سے لاؤں



یہ دل اے دوست جنگل ہو چکا ہے
تمھارا پیار پاگل ہو چکا ہے

مجھے اک عمر تک رہنا یہاں ہے
قیامت خیز پل پل ہو چکا ہے

اُگے ہیں کھیت میں آہوں کے پودے
برس کر خالی بادل ہو چکا ہے

تمھارے ساتھ جو کچھ اب ہوا ہے
وہ میرے ساتھ تو کل ہو چکا ہے

مری آنکھیں بھی پتھرائی ہوئی ہیں
لہو آمیز کاجل ہو چکا ہے

مجھے کچھ نیند سی آنے لگی ہے
مرا قصہ مکمل ہو چکا ہے

اُدھر بننا سنورنا چھوٹ گیا ہے
اِدھر ارشدؔ بھی بیکل ہو چکا ہے



ہمارا حال ماضی کی کسک ہے
ہماری زندگی دل کی کھٹک ہے

گلی میں آگ پتھر اور چیخیں
مگر کمرے میں پائل کی کھنک ہے

فرشتے رہ گئے تسبیح پڑھتے
رسائی آدمی کی عرش تک ہے

ابھی اُس کی نظر مجھ پر لگی ہے
مرے چہرے میں تھوڑی سی چمک ہے

مجھے پھر سو طرح سے آزمانا
اگر تم کو مری نیت پہ شک ہے

مسافر تھک کے سویا زندگی کا
بڑی لمبی تمنا کی سڑک ہے

کہیں سورج، کہیں ذرہ، وہی ایک
پرندوں کی چہک، گل کی مہک ہے

ہمیں ان آندھیوں سے خوف کیسا
کہ ارشدؔ ہم میں پودوں سی لچک ہے



اپنی تنہائی میں ہوتے ہوئے ڈر لگتا ہے
کوئی دیکھے ہے کہ روتے ہوئے ڈر لگتا ہے

سانس ٹوٹے گی تو مٹی کا بچھونا ہوگا
پھول کی سیج پہ سوتے ہوئے ڈر لگتا ہے

جوش میں دریا چڑھ آیا تھا مرے گھر اک بار
پاؤں پانی میں بھگوتے ہوئے ڈر لگتا ہے

چغلی کھائے گا ہمیشہ ہی مرے چہرے کی
گرد آئینے کی دھوتے ہوئے ڈر لگتا ہے

شہر کی آب و ہوا ٹھیک نہیں ہے ارشدؔ
پیار کا بیج بھی بوتے ہوئے ڈر لگتا ہے



دل تڑپنے لگا ، خون رسنے لگا ، دھول اڑنے لگی ، رات ڈھلنے لگی
اپنے ماضی کے بستر سے میں اٹھ گیا ، یاد رو رو کے آنکھیں مسلنے لگی

وقت وہ بے وفا ہے کہ میں کیا کہوں، اونچے لوگوں کے بھی ساتھ رہتا نہیں
حسن کا چاند بھی ٹمٹمانے لگا اور زمیں پر محبت مچلنے لگی

کس کی یادوں کا سنسان جنگل ہے یہ، کارواں تھک گیا سوچتے سوچتے
زخم کے سیکڑوں خیمے گڑنے لگے ، درد کی آگ بھی پاس جلنے لگی

مجھ کو دنیا کی نعمت نہیں چاہیئے، مجھ کو رضواں کی جنت نہیں چاہیئے
اُن کی نظروں کے مرکز میں پہنچا ہوں میں اور میری طبیعت سنبھلنے لگی

رات اس چھت کے نیچے کئی لوگ تھے ،محفلِ قہقہہ کے اہم رکن تھے
میری خوشیوں کی دیوار اچانک گری ، دوستی ننگے پاؤں نکلنے لگی

میرے کچے منڈیروں کے جلتے دیے، میرے ویران آنگن کی اک شان تھے
آندھیوں کو خبر آسمانوں نے دی اور پھر اُن کی نیت بدلنے لگی

زندگی دیر تک مجھ کو تکتی رہی ، پھر ملاقات کا عہد کرتے ہوئے
منہ پہ چادر اداسی کی تانے ہوئے موت ارشؔد مرے ساتھ چلنے لگی



جو میرے دل میں کبھی تھا اب آستین میں ہے
وفا کا نام زمیں پر وفا زمین میں ہے

حویلی والے بھی چکر اِدھر لگاتے ہیں
مکاں میں کچھ نہیں، سب کچھ مگر مکین میں ہے

بسا کرے گا ہمیشہ ہی دشتِ بے دینی
بہت ہی تنگ جگہ جب تمھارے دین میں ہے

تھکے تھکے سے کئی ہونٹ اِس پہ ٹھہرے تھے
کہ سرخ نور کی اک لہر سی جبین میں ہے

دعا کرو کہ مرے درد کا پتہ چل جائے
بہت دنوں سے مری فکر چھان بین میں ہے

نہ درد ہے نہ مروت کی روح ہے ارشدؔ
اس آدمی میں وہی کچھ ہے جو مشین میں ہے



وہ میرا تصور بھی گوارا نہیں کرتے
تنہائی میں یہ کام تو اچھا نہیں کرتے

ہم شیشہ ہیں اور ٹوٹنا تقدیر ہے پھر بھی
پتھر کے نگر میں کوئی رشتہ نہیں کرتے

تہذیب نئی ، دور نیا ، فکر نئی ہے
اللہ پہ بھی لوگ بھروسا نہیں کرتے

ہم رات کے راہی ہیں ہمیں کام بہت ہے
سورج کے بھروسے پہ سویرا نہیں کرتے

کاغذ کی کسی ناؤ کے مانند ہے ہستی
جیتے ہیں مگر جینے کا دعویٰ نہیں کرتے

آجائے گا جی میں تو لٹا دیں گے ہم اِن کو
ویسے تو دل و جان کا سودا نہیں کرتے

تم اپنے قبیلے کے خدا ہو تو ہمیں کیا
ہم سارے خداؤں کو تو سجدہ نہیں کرتے

یہ لوگ منافق ہیں اِنھیں دیکھ لو ارشدؔ
ملتے ہیں مگر سامنے چہرہ نہیں کرتے



یاد کرتے رہے اور روتے رہے
داغ میرے لہو کا وہ دھوتے رہے

جاگنا تھا یہ جاگے تو مرنے کے بعد
عمر بھر ہم کھلی آنکھ سوتے رہے

آم کا پھل میسر ہو ممکن نہیں
آپ تو نیم کے بیج بوتے رہے

یاد کی سوئی سے درد کی ڈور میں
اپنے اشکوں کے موتی پروتے رہے

چھلنی چھلنی یہ دل مر نہ جائے کہیں
سوئیاں خواہشوں کی چبھوتے رہے

جس سے انکار تھا ساری مخلوق کو
آج تک ہم وہی بوجھ ڈھوتے رہے

اک تری بدسلوکی سے ارشدؔ کو کیا
حادثے اِس طرح کے تو ہوتے رہے



اُس کا سراپا جیسے کوئی روشنی کا گھر
اور میں بجھا بجھا سا کسی بیکسی کا گھر

اِس دیس میں ہیں خویش و اقارب مرے بہت
میں ہوں کہ ڈھونڈھتا ہوں اُسی اجنبی کا گھر

جنگل میں جو بہار نہیں وہ یہاں پہ ہے
ایسا دیا خدا نے مجھے زندگی کا گھر

آدم کا خاندان کہاں جا کے بس گیا
میں نے بہت تلاش کیا آدمی کا گھر

دیکھا خدا کا گھر تو کہا اک گنوار نے
ایسا تو شاندار نہیں ہے کسی کا گھر

اللہ! مجھ پہ اتنے مصائب ہیں کس لئے
ارشدؔ کا گھر ہے یہ نہیں آلِ نبی کا گھر



فلک سے چاند غائب تھا بڑی گہری سیاہی تھی
زمیں کے حق میں یہ کیسی سزائے بے گناہی تھی

یہ مانا وہ بڑا ہی خود غرض ، بے درد تھا لیکن
میں اُس سے توڑتا رشتہ تو اپنی ہی تباہی تھی

مرا سچ بیچ چوراہے پہ ننگا ہوگیا کیونکہ
ترے حق میں فقیہ شہر کی روشن گواہی تھی

غبار آلود میرا سر ہوا اُس کو بچانے میں
مرے اجداد کی صدیوں جو شان کجکلاہی تھی

جسے سونا سمجھ کر لے گئے ہیں لوگ محلوں میں
اُنھیں معلوم کیا ارشدؔ کہ مٹی خانقاہی تھی



اہل دل جو سجاتے رہے انجمن ، ہم وہاں باعث خیرو برکت ہوئے
لوگ پتھر کے بستے ہیں اس شہر میں ،جس گلی بھی گئے جا کے زحمت ہوئے

غم کی پرچھائیں میرے گلے پڑ گئی،چین وآرام مجھ سے خفا ہوگئے
روزِ اول سے دشمن رہا آسماں ، آپ بھی اِس قدر بے مروت ہوئے

بند آنکھوں سے دنیا کو دیکھا کریں، ریت کے خشک سینے کو دریا کریں
اب جو ہونا ہے وہ اپنی ہمت سے ہو،اہل کشف وکرامات رخصت ہوئے

درودیوار سے بات کرتے ہوئے، یوں خلاؤں میں رہ رہ کے تکتے ہوئے
لڑکے آتے ہیں پتھر اٹھائے ہوئے ، یعنی ہم مبتلائے محبت ہوئے

اس میں بے چارے موسم کا ہے جرم کیا، یہ درختوں کی تقدیر کی بات ہے
کچھ تو بڑھنے سے پہلے ہی مرجھا گئے، کچھ بڑھے اور کچھ سرو قامت ہوئے

یہ فریبوں کا جنگل ہے پھیلا ہوا،سب سیاست کے حیوان آباد ہیں
آدمیت کہیں سوگئی غار میں ، ارشدؔ اب آپ بے قدرو قیمت ہوئے



مجھ سے شب فراق بھلائی نہ جائے گی
لیکن کسی کو وجہ بتائی نہ جائے گی

یہ اشک و آہ کس لئے آتے ہیں رات دن
کیا چیز دل میں ہے کہ دکھائی نہ جائے گی

تم بے وفا بنو کہ زمانہ ستم کرے
دل سے تمھاری یاد مٹائی نہ جائے گی

اک بوند چکھ کے چاک گریباں وہ ہوگیا
کم ظرف کو شراب پلائی نہ جائے گی

مانا کہ ہے تمھی سے مرے محسنو! مگر
عزت تمھارے نام لٹائی نہ جائے گی

وعدوں کو چھوڑ، صاف سنا! فیصلہ ہے کیا؟
ایسے تمام عمر گنوائی نہ جائے گی

کٹ جائے یا رہے مجھے پرواہ کچھ نہیں
گردن ترے حضور جھکائی نہ جائے گی

ساتھی بنا لیا ہے تمھارے خیال کو
تنہا تو مجھ سے رات بتائی نہ جائے گی

غم کھا کے ہنسنے والا وہ ارشدؔ چلا گیا
یہ رسم پھر کسی سے نبھائی نہ جائے گی



مرے جرمِ محبت کی شکایت عام کرتے ہیں
مجھے کیا، وہ خود اپنے آپ کو بدنام کرتے ہیں

مجھے اک بوند بھی دیتے نہ تھے کل تک مگر اب تو
صراحی سامنے رکھتے ہیں، آگے جام کرتے ہیں

ہماری زندگی و موت کا اتنا فسانہ ہے
تھکے ماندے ہیں دن بھر کے ابھی آرام کرتے ہیں

بدن میں جاں نہ دل میں درد اور غم سے رہائی بھی
ترا ہم احترام اے گردشِ ایام کرتے ہیں

اُنھیں کہہ دو کہ ارشدؔ ہو گیا بے دل زمانے سے
اب اُس سے دل لگی کی کوششیں ناکام کرتے ہیں



وعدوں کا کرشمہ ہے کبھی آ نہ سکو گے
رہنے دو تم اِس دور کے غم کھا نہ سکو گے

چلنا ہے تو پھر ساتھ چلو شانہ بہ شانہ
ستانے لگو گے تو ہمیں پا نہ سکو گے

اُس چیختے جلتے ہوئے منظر میں یہ بچے
اب اِن کو کھلونوں سے تو بہلا نہ سکو گے

بہتر ہے اسے سچ کے اجالوں میں چھپا دو
تم اتنے بڑے جھوٹ کو دفنا نہ سکو گے

اس اونچی حویلی میں مرا خون ہے ارشدؔ
یہ بات مری نسل کو سمجھا نہ سکو گے



ترے سائے میں آنا چاہتا ہوں
الگ دنیا بسانا چاہتا ہوں

زمیں تھوڑی سی دے دو اپنے دل کی
محبت میں اگانا چاہتا ہوں

مری آنکھوں نے سب سے کہہ دیا ہے
میں دردِ دل چھپانا چاہتا ہوں

تری شان مسیحائی بڑی ہے
میں اپنا دل دِکھانا چاہتا ہوں

مگر وہ کچھ سمجھتے ہی نہیں ہیں
انھیں میں کیا بتانا چاہتا ہوں

ارے توبہ ترقی پر ترقی !
میں ارشدؔ کو گرانا چاہتا ہوں



وہ اتنی چیختی دنیا میں ایسے یاد آتے ہیں
کہ جب وہ یاد آتے ہیں، اکیلے یاد آتے ہیں

میں کہتا تھا تو ہنستے تھے، مری کچھ بھی نہ سنتے تھے
اب اُن پر آ پڑی تو غم کے مارے یاد آتے ہیں

سلگتے ہونٹ ، نور افزا تبسم ، آتشیں رخسار
اندھیری رات میں یہ سب اجالے یاد آتے ہیں

مجھے اُس قیمتی موتی کی خواہش تھی، طلب بھی تھی
بھنور میں پھنس کے دریا کے کنارے یاد آتے ہیں

تھکن، الجھن، اداسی کے سوا کچھ بھی نہ ہاتھ آیا
وہ دنیا اور اس کے ناز و نخرے یاد آتے ہیں

میں مستقبل کے آئینے میں جب بھی جھانکتا ہوں تو
مجھے ماضی کے سب بے رنگ لمحے یاد آتے ہیں

یہ فطرت کا تقاضا ہے کہ خود غرضی کا جذبہ ہے
زمیں جب تپ رہی ہوتی ہے، سائے یاد آتے ہیں

مجھے کاندھے پہ لے کر لوگ جاتے ہیں کہاں ارشدؔ
مجھے رہنے دو مجھ کو بے سہارے یاد آتے ہیں



جتنے اچھے لوگ تھے سب جا چکے
اپنا اپنا تجربہ سمجھا چکے

دل کی کالک دن بہ دن بڑھتی گئی
اپنے جسموں کو بہت نہلا چکے

گولیاں ، بارود اِن بچوں کو دو
ہم کھلونوں سے اِنہیں بہلا چکے

پتھروں کا ڈھیر الماری میں ہے
پھول بوڑھے ہاتھ اب برسا چکے

بات جو ننگی تھی سو ننگی رہی
لفظ کے جامے کئی پہنا چکے

جھوٹ اپنی جیت پر ہنستا رہا
آپ ارشدؔ سچ بہت فرما چکے



نہ جانے کیوں وہ اپنی خلوتوں سے دور کرتے ہیں
مجھے دنیا میں جینے کے لئے مجبور کرتے ہیں

پرائی زندگی ، بیگانہ دل ، نا آشنا جذبہ
کہاں لا کر ذرا سی جان کو محصور کرتے ہیں

غموں کی دھوپ میں دل کے شجر کو اشک کا پانی
بہارِ درد کا یہ رنگ ہم منظور کرتے ہیں

مری پرچھائیں اُن کے سامنے کچھ اِس طرح جھلکی
وہ آنکھیں بند کر کے آئینے کو چور کرتے ہیں

تبسم کے اجالوں میں تپش ہے نامرادی کی
وہ جس سے بات کرتے ہیں، اُسے رنجور کرتے ہیں

مرے سینے پہ اپنا ہاتھ رکھ کر بھی ذرا دیکھیں
سنا ہے آپ چھو کر درد کو کافور کرتے ہیں

کچھ اُن کے کالے کرتوتوں پہ پردہ پڑ گیا ارشؔد
مرے اک جرم کو وہ اِس قدر مشہور کرتے ہیں



دل کے علاوہ اور تو سب خیریت سے ہے
اور وہ بھی مجھ کو چھوڑ کے اب خیریت سے ہے

اُس کا مزاج کوئی نہیں پوچھتا مگر
الماریوں میں اردو ادب خیریت سے ہے

رشتے ، خلوص ، پیار ، وفا اور تعلقات
سب کچھ گنوا چکا ہے وہ، تب خیریت سے ہے

چوٹ اُس نے کھائی، درد سے میں بلبلا اٹھا
میں بھی ہوں خیریت سے وہ جب خیریت سے ہے

ارشدؔ نہ دل میں شور نہ آہوں کے سلسلے
کیا بات ہے کہ آج کی شب خیریت سے ہے



میں تنہا غم جھیل رہا ہوں اتنے سارے یاروں میں
یعنی ایک نگینہ بھی ہے کانچ کے ان انباروں میں

سب کو پتہ ہے، میں مدت سے مصروف تنہائی ہوں
مجھ سے ملنے کوئی نہ آیا میلوں میں، تہواروں میں

مجھ کو ٹکٹ جنت کا نہ دیں گے پگڑی جبے والے لوگ
زیرِ غور ہے میرا ایماں دین کے ٹھیکیداروں میں

جو کرنا ہے کر بھی گذرو، کیا یہ لمبی چوڑی مٹنگ
جو کہنا ہے صاف کہو نا، کیا کہتے ہو اشاروں میں

سچی اور کھری باتوں کی میری دکان اجڑ ہی گئی
ہونے لگی ہے ضمیر فروشی جب سے اِن بازاروں میں

وہ دولت کا حوالہ لے کر آیا فوراً کام ہوا
ورنہ لوگ کھڑے تھے کب سے لمبی لمبی قطاروں میں

میرے گھر میں پہلے ہی سے غم کا اک دروازہ تھا
رخنہ کس نے ڈال دیا ہے خوشیوں کی دیواروں میں

ظلم و وحشت رہتے ہیں ارشدؔ آبادی میں شب بیدار
نیکی، شرافت سوئی پڑی ہے جا کے پرانے غاروں میں



اشک بے اختیار آئے ہیں
چھوڑ کر انتظار آئے ہیں

دل پہ رکھیں کہاں کہاں مرہم
زخم تو بے شمار آئے ہیں

عشق پر اُن کو بدگمانی تھی
آج وہ شرمسار آئے ہیں

دل ہنسا پھر کسی نصیحت پر
یہ مرے غمگسار آئے ہیں

موت ہے یا خدا کے کارندے
لے کے میرا قرار آئے ہیں

نامِ امید پُرکشش ہے بہت
کھو کے پھر اعتبار آئے ہیں

وقت نے سب کو دے دیا دھوکا
کھا کے گردو غبار آئے ہیں

دیکھئے کیا ہو اُن کی محفل میں
ارشدؔ بے قرار آئے ہیں



دل لگائیں بھی تو کس سے آشنا کوئی نہیں
کیا ہماری زندگی میں اے خدا! کوئی نہیں؟

میں اگر ہوں پیڑ کا سایہ تو تم صحرا کی ریت
یا حقیقت کچھ نہیں یا دیرپا کوئی نہیں

کچھ تو ہے مجبوریِ حالات کچھ اپنی پسند
بے وفا ہوتے ہیں لیکن بے وفا کوئی نہیں

چلتی پھرتی بھیڑ سے دھوکا نہیں کھاتا ہوں میں
یوں تو کہنے کو سبھی ہیں اور مرا کوئی نہیں

اِک تصور عرش سے نازک تر آتا ہے مجھے
جب مرے پہلوئے دل میں دوسرا کوئی نہیں

مے بھی ہے مینا بھی ہے موسم بھی ہے ساقی بھی ہے
پینے والے پی رہے ہیں ، میکدہ کوئی نہیں

ہے غمِ جاناں میں ارشدؔ مبتلا تو کیا ہوا
آپ کو دنیا کا غم ، غم سے رہا کوئی نہیں



وہ وعدے پہ وعدہ کئے جا رہے ہیں
خود الجھے ہیں، مجھ کو بھی الجھا رہے ہیں

جنھیں موتیوں کی بڑی آرزو تھی
اتر کر سمندر میں پچھتا رہے ہیں

بھلا چڑھتے سورج کو دیکھا نہیں ہے
جو اپنی بلندی پہ اترا رہے ہیں

بچھاتے تھے جو میری راہوں میں کانٹے
جنازے پر اب پھول برسا رہے ہیں

کہ ہم آدمی کے ستائے ہوئے ہیں
تو اب آئینے سے بھی گھبرا رہے ہیں

اب اُس بے وفا سے شکایت بھی کیسی
ہم اپنے کئے کی سزا پا رہے ہیں

اب ارشدؔ کو استاذ کی کیا ضرورت
کہ دن رات حالات سمجھا رہے ہیں



وہ کسی حال میں مرا نہ ہوا
خیر ، جو کچھ ہوا برا نہ ہوا

چاند سورج وہاں اترتے ہیں
اپنی چوکھٹ پہ اک دیا نہ ہوا

میں نے مانا کہ بانٹتا تھا حیات
ابن مریم مگر خدا نہ ہوا

دن بہ دن بڑھ رہی ہے گمراہی
رہنما کوئی رہنما نہ ہوا

غمِ جاناں غلط ہوا کب کا
دل مگر درد سے رہا نہ ہوا

لکھ پتی بن گئے مگر ارشدؔ
دودھ کا قرض بھی ادا نہ ہوا



ظلمتیں جاگ اٹھیں ، روشنی سوگئی
شہر ویراں ہوا ، زندگی سو گئی

چیختی زندگی سے میں بہرا ہوا
درد بھی چپ ہوا ، چوٹ بھی سوگئی

اُن کو آنا تھا لیکن وہ آئے نہیں
میرے عشرت کدے میں خوشی سوگئی

میں اکیلا شب غم سے لڑتا رہا
پھول کی سیج پر دوستی سوگئی

آخری روشنی آج گل ہوگئی
آسماں بجھ گیا اور گلی سو گئی

وادیِ فکر کی سیر ادھوری رہی
تھک کے ارشؔد مری شاعری سوگئی



سنا ہے، جب کبھی یادوں کی چنگاری بھڑکتی ہے
جہنم سے بھیانک آگ سینے میں دہکتی ہے

اُسے اندر کی ویرانی کا اندازہ نہیں ہوتا
یہ صبح و شام جو چڑیا مری چھت پر چہکتی ہے

خیالوں کے کھنڈر میں درد کی چیخیں مسلسل ہیں
کسی کی روح صدیوں سے مرے اندر بھٹکتی ہے

جھٹک دیتی ہے اُس کا ہاتھ یہ دنیا، تو بے چاری
مری دہلیز پر آ کر مصیبت سر پٹکتی ہے

تنی رہتی تھی جو جھوٹے خداؤں کی سیاست میں
وہی گردن تو آخر کار سولی پر لٹکتی ہے

ہمارے شہر کا ماحول کچھ ایسا نرالا ہے
کہیں چیخیں تھرکتی ہیں، کہیں پایل کھنکتی ہے

میں ارشدؔ زندگی کی جنتوں میں ہوں مگر پھر بھی
مرے پہلو میں کوئی چیز رہ رہ کر کھٹکتی ہے



کانٹوں کی زباں رکھتے ہیں وہ غنچہ دہن میں
پتھر سی کوئی چیز ہے مرمر کے بدن میں

پردیس میں بیگانوں کے گھر پائی ہے عزت
بیگانہ ہوا جاتا ہوں میں اپنے وطن میں

ہونے لگی الہام کی دہلیز پہ دستک
میں سربگریباں جو ہوا فکرِ سخن میں

محلوں کے اجالوں میں مرا رنگ ہوا زرد
پودے تو ہرے ہوتے ہیں سورج کی کرن میں

اک شخص برہنہ وہیں لیٹا تھا زمیں پر
احباب نے رکھا مجھے چاندی کے کفن میں

اُس نے کبھی چہرے سے کیا ہی نہیں محسوس
ارشدؔ نے کہا بھی نہیں، کیا ہے مرے من میں



تمھاری بے وفائی کا کوئی شکوہ نہیں کرتا
کہ غیرت مند اپنے آپ کو رسوا نہیں کرتا

لرزتا ہوں کہ اُس کے نفس میں گہری خموشی ہے
میں قطرے کو کبھی بھی شاملِ دریا نہیں کرتا

سنا ہے، وہ رگ جاں سے بھی ہے نزدیک تر لوگو!
تو پھر کیا ہے کہ اپنا حسن بے پردہ نہیں کرتا

تمھارے چاہنے والے نے جنت کی نہیں سوچی
تمھاری یاد کا مارا غم دنیا نہیں کرتا

بزرگوں نے غریبوں کے لہو سے اِس کو سینچا تھا
یہی وہ پیڑ ہے ارشدؔ پہ جو سایہ نہیں کرتا



تری یاد میرے قریب تھی، مرے درد دل میں سنبھل گئے
جو خیال مجھ کو عزیز تھے، وہ بھی دھیرے دھیرے نکل گئے

مری جستجو سرِ عرش تھی ، مرا مدّعا بھی کچھ اور تھا
کوئی آ کے خلد کی کہہ گیا تو تمام لوگ بہل گئے

مجھے وقت چھوڑ کے جا چکا ، اُنھیں لوگ سر پہ اٹھا لئے
میں ہوں اپنے حال پہ آج بھی، وہ جگہ جگہ سے بدل گئے

مرا ہاتھ تھا ترے ہاتھ میں ، مرے پاؤں تھے ترے ہمقدم
یہ جو بادلوں کا کرم ہوا ، ابھی چلتے چلتے پھسل گئے

وہ جو رقص کرتے تھے ساز پر، وہ جو جاں لٹاتے تھے راگ پر
یہ صدا تھی اپنے ضمیر کی جسے لوگ سن کے دہل گئے

مرے ہاتھ کا یہ کمال تھا کہ کسی کا عہدِ زوال تھا
جو کھرے تھے وہ تو کھرے رہے، مرے کھوٹے سکے بھی چل گئے

مجھے ارشدؔ اپنی حیات کا نہ بھروسا ہے نہ کبھی رہا
وہ جو آفتاب تھے وقت کے ابھی دوپہر ہوئی ڈھل گئے



اِس قدر مجھ سے بد گماں ہوئے
جتنے دشمن تھے مہرباں ہوئے

سر جھکانا پڑا زمیں کی طرف
تم ہوئے بھی تو آسماں ہوئے

اُس نے تھوڑی سی لب کشائی کی
بولتا لوگ بے زباں ہوئے

وہ جو معروف تھے زمانے میں
مجھ سے پہلے ہی بے نشاں ہوئے

کیسی آہٹ ہے کیسی دستک ہے
اتنے بے کار میرے کان ہوئے

وقت یکساں نہیں کسی کا بھی
جو حقیقت تھے داستاں ہوئے

کچھ نتیجہ نہ پا سکا ارشدؔ
زندگی میں بس امتحاں ہوئے



وہ سب سے بے تکلف بولتا ہے
میرے سینے میں اُف اُف بولتا ہے

یہ بے آواز جان و دل کے اندر
کوئی حرف تأسف بولتا ہے

میں اپنے بند کمرے میں پڑا ہوں
زمانے سے تعارف بولتا ہے

ذرا سی شاعری کیا آگئی ہے
یہ ارشؔد بھی تصوف بولتا ہے



نظامِ زندگی پھر سے بنانے کی ضرورت ہے
کہ گرتی چھت کو مل جل کر اٹھانے کی ضرورت ہے

تری یادوں کے دامن میں سمٹ آیا ہوں چپکے سے
مجھے صحرائے غم میں سر چھپانے کی ضرورت ہے

تو اپنی ضد پہ قائم ہے ، مجھے اپنی انا پیاری
قدم دونوں کو ہی آگے بڑھانے کی ضرورت ہے

خیال اپنا بھی آجاتا ہے چلتے چلتے مشکل ہے
بڑے پتھر کو رستے سے ہٹانے کی ضرورت ہے

دیا سچ کا پریشاں ہوگیا جھوٹی ہواؤں سے
جسے جلنا تھا اب اس کو بجھانے کی ضرورت ہے

نہ جانے کتنے گھر اُس نے اجاڑے اور اب ارشدؔ
اُسے خود آج اپنا گھر بسانے کی ضرورت ہے



درد کے ساز پر یاد کے گیت ہم موسمِ اشک میں گنگناتے رہے
ایک مدت ہوئی اُن کو روٹھے ہوئے، پاگلوں کی طرح ہم مناتے رہے

دوستی نے بڑی بے وفائی جو کی ، زندگی نے وہیں بڑھ کے رسوائی دی
ایک چھوٹا سا دل اور دنیا کا غم ، یعنی کوزے میں دریا سماتے رہے

مجھ کو جس پھول سے پیار تھا کیا کہوں دھوپ نے چاٹ کھایا ہے سب اُس کا رنگ
پھر تو آوارہ بادل گذرتے رہے اور اُسے شاخ سے توڑ لاتے رہے

صبر کی وادیوں میں میں چلتا رہا ، آبلے پھوڑ کر آگے بڑھتا رہا
اُن کی مرضی ملی ، بس یہی سوچ کر زخم جتنے تھے سب مسکراتے رہے

بوند بوند اشک سب خاک میں مل گئے، میری آنکھوں کے بجھنے لگے ہیں دیے
مجھ کو اپنے کیئے کی سزا مل چکی ، وہ محبت پہ تہمت لگاتے رہے

کوچۂ یار میں ہے مری زندگی ، دین ودنیا کی ہیں ساری خوشیاں وہیں
میں نے ارشدؔ کسی کی بھی اک نہ سنی ، لوگ جنت کا رستہ بتاتے رہے



عجب سی بے قراری ہو رہی ہے
یہ کیا حالت ہماری ہو رہی ہے

یہ کس کی یاد، کیسی آرزو ہے
مسلسل اشکباری ہو رہی ہے

مجھے احباب کرتے ہیں نصیحت
یہ اچھی غمگساری ہو رہی ہے

میں زندہ لاش ہوں مجھ کو نہ گننا
اگر مردم شماری ہو رہی ہے

ادھر ماحول ہنستا مسکراتا
ادھر سے ضرب کاری ہو رہی ہے

مرے بچے گئے ہیں کھیلنے کو
سڑک پر مارا ماری ہو رہی ہے

چلو بھی کوچۂ جاناں سے ارشدؔ
بڑی دُرگت تمھاری ہو رہی ہے



رات ایسی بھی آئے گی ، سوچا نہ تھا
کچھ بھی جاگا نہ تھا ، کچھ بھی سویا نہ تھا

ذرّے ذرّے میں جلوہ اُسی ایک کا
میں نے دیکھا ، مگر کچھ بھی دیکھا نہ تھا

پیار کے بول سب آگ کے پھول تھے
اِس قدر بے وفا ہے وہ ، سمجھا نہ تھا

ناگنوں کا بسیرا تھا اس پیڑ پر
ہارے ماندے مسافر نے جانا نہ تھا

آج وہ میرے گھر آ گیا ، خیر ہو
جو مرے پاس اک پل بھی ٹھہرا نہ تھا

اُس کے منہ سے نکلتی ہیں چنگاریاں
پیٹ ابھی اُس کے بچوں کا سلگا نہ تھا

اُس کی سوچوں پہ قبضہ ہے بدخواہوں کا
اب تلک اُس نے ارشؔد کو سمجھا نہ تھا



یاد ہر وقت آئے گی سوچا نہ تھا
مجھ سے دنیا بھلائے گی سوچا نہ تھا

دل کے آنگن میں اک درد کا پیڑ تھا
آنکھ برسات لائے گی سوچا نہ تھا

دل کی سوداگری وقت کی مانگ تھی
ہاتھ سے جان جائے گی سوچا نہ تھا

پہرہ ظلمت کا تقدیر کے در پہ تھا
روشنی گھر میں آئے گی سوچا نہ تھا

اُن کی چاہت مجھے اِس طرح ٹوٹ کر
پھر گلے سے لگائے گی سوچا نہ تھا

منصفوں کی طرف ظلم کی دوستی
ہاتھ اپنا بڑھائے گی سوچا نہ تھا

پھول کی سیج پر پیار کے ہاتھ سے
زندگی چوٹ کھائے گی سوچا نہ تھا

آنکھ کے جگنوؤں سے پھر ارشدؔ کی رات
اِس طرح جگمگائے گی سوچا نہ تھا



تھرتھراتے ہوئے ہونٹوں پہ کچھ آنسو رکھ دے
میرے ویران اندھیرے میں یہ جگنو رکھ دے

تاکہ سب دیکھ لیں، دنیا میں تھا وہ کس کا اسیر
مرنے والے کے کفن میں ذرا گیسو رکھ دے

وقت انصاف کہاں ظلم کے ہنگامے میں
کوئی کہتا ہے کہ جا اپنے ترازو رکھ دے

میری ننھی سی ہتھیلی کو کسی نے چوما
سیکڑوں خلد کی جیسے کوئی خوشبو رکھ دے

ٹوٹ سکتی ہے مگر جھک نہیں سکتی یہ کمر
جھوٹ کی سِل بھی مرے سچ پہ اگر تو رکھ دے

ورنہ ارشدؔ تجھے کردے گا زمانہ رسوا
اپنی ہمت کو اٹھا غیر کے بازو رکھ دے



توہمات کے سائے میں جی رہا ہے وہ
امامِ اہلِ خرد بھی بنا ہوا ہے وہ

میں اُس سے بھاگتا پھرتا ہوں اک زمانے سے
مرے نصیب میں شاید لکھا ہوا ہے وہ

تمام شہر جلا کر اچھل پڑے ظالم
کہ ایک بچہ ابھی تو بچا ہوا ہے وہ

میں لمحہ لمحہ بدلتا ہوں لفظ کے جامے
پہ مہملات پہ اب تک جما ہوا ہے وہ

جو سب کے گھر میں خوشی کے دیے جلاتا تھا
لے آج اپنی گلی میں بجھا ہوا ہے وہ

جو میرے سامنے اپنائیت دکھاتا ہے
مخالفین کے ہاتھوں بکا ہوا ہے وہ

ہو کوئی کانٹا تو جھک کر اسے نکالیں بھی
خیال بن کے جگر میں چبھا ہوا ہے وہ

جو ذرّے ذرّے میں دیکھا گیا ہے اے ارشدؔ
مری نگاہ سے پھر بھی چھپا ہوا ہے وہ



مجبور اتنا کرتی ہے قسمت کبھی کبھی
کافر سی ہوگئی ہے طبیعت کبھی کبھی

میں زاہدوں کی بات میں تجھ کو نہ بھول جاؤں
مجھ پر سوار ہوتی ہے جنت کبھی کبھی

تم سے منافقت کی شکایت میں کیا کروں
کچھ میں بھی ہار جاتا ہوں ہمت کبھی کبھی

چھوڑا ہے مفلسی نے مجھے برکتوں سے دور
آتے تھے میرے گھر پہ بھی حضرت کبھی کبھی

مانا کہ بے وفا ہو مگر ہو تو آدمی
تھوڑی سی اس طرف بھی عنایت کبھی کبھی

ایسا نہ ہو خدا کہ میں لگ جاؤں داؤ پر
ہوتی ہے سَر وَبال یہ عزت کبھی کبھی

ارشدؔ مجھے ہے رونقِ دنیا سے کچھ گریز
لیکن بگڑ بھی جاتی ہے نیت کبھی کبھی



اپنے ہی لئے سیکڑوں آزار ہوئے ہم
کچھ ایسے ہی حالات سے دوچار ہوئے ہم

میخانے میں اب حکم ہمارا بھی چلے گا
ساقی سے کہو صاحب دستار ہوئے ہم

دریائے مقدر میں تھا طوفان سا برپا
تدبیر کی کشتی پہ مگر پار ہوئے ہم

یہ خون ہمارا ہے ، اٹھاتے تھے ہم اس کو
قاتل ہے کوئی اور گرفتار ہوئے ہم

دم گھٹنے لگا اب کے محبت کی فضا میں
ماحول یہ کیسا ہے کہ بے کار ہوئے ہم

آئین کہاں کا ہے یہ کیسی ہے حکومت
حق مانگنے آئے ہیں تو غدار ہوئے ہم

پلکیں تو ہمیشہ ہی رہیں نیند سے بوجھل
جب آنکھ ہوئی بند تو بیدار ہوئے ہم

اک عمر گئی اُس کو منانے میں جب ارشدؔ
تب اُس کی محبت کے سزاوار ہوئے ہم



خود وہ آتے بھی نہیں ، پاس بلاتے بھی نہیں
مصلحت کیا ہے، زمانے کو بتاتے بھی نہیں

مشغلہ آپ نے کیا خوب بنا رکھا ہے
آزماتے بھی نہیں اور ستاتے بھی نہیں

وہ ہمیں لوٹ کے مایوس نہ ہو جائے کہیں
ہم تو روتے بھی نہیں ، شور مچاتے بھی نہیں

لے کے اُٹھے ہیں وہ تحریکِ محبت ارشؔد
گھر میں بھڑکی ہوئی نفرت کو مٹاتے بھی نہیں



کس احتیاط سے گذری ہے زندگی میری
کہ دل کو چھو نہ سکی آج تک خوشی میری

ہوا کا بس نہیں چلتا ہے چاند سورج پر
بجھانے آئی ہے کمزور روشنی میری

وہ رنگ چہرے کا اڑنا ، وہ ضبط کھو دینا
جو بات نکلی ترے سامنے کبھی میری

وہ جھوٹ ننگی سڑک پر اٹھائے پھرتا ہے
میں اپنے سچ کو چھپاؤں! یہ بے بسی میری

جسے نشہ تھا بہت رنگ و نور کا ارشؔد
وہ دیکھ دیکھ کے مرتا ہے سادگی میری



وہ لڑ جھگڑ کے جو مجھ سے جدا ہوا بھائی
تو میں ہی سب کی نظر میں برا ہوا بھائی

زمانہ مجھ کو بہت کوستا تھا ، ہنستا تھا
خدا کا شکر کہ وہ بے وفا ہوا بھائی

مجھے پتہ تھا مگر موت اپنے بس میں نہ تھی
مرے نہ ہونے سے سب کا بھلا ہوا بھائی

یہ لوگ بڑھ کے مجھے تھام بھی تو سکتے تھے
میں گر گیا ہوں تو کہتے ہیں: کیا ہوا بھائی

جو سایہ بانٹ رہا تھا مرے محلے کو
وہ سخت دھوپ میں رہ کر ہرا ہوا بھائی

مرے ہی جیسا نہ ہو جائے حال ارشدؔ کا
سنا ہے، وہ بھی کھلے ذہن کا ہوا بھائی



ذہن ودل کی ہر بستی میں دھوم مچانے والی تھی
خاک کی چادر منہ پر تانے ذات وہ سونے والی تھی

شانہ بہ شانہ چلنے والے دیکھ کر اب گھبراتے ہیں
ساری توجہ ہٹ گئی مجھ سے ، بات بگڑنے والی تھی

دریا میرا دوست پرانا، اُس کے ہاتھ میں ساحل تھا
میری جماعت مجھ کو ڈبو کے پار اترنے والی تھی

اک دو شعر پہ واہ وا کر کے وقت کا مصرف جان لیا
میری غزل تو اور بہت کچھ تم سے کہنے والی تھی

بھیڑ بہت ہے، کام زیادہ، رستہ ٹیڑھا، وقت بھی کم
سانسوں کے لشکر کی طاقت بھی کب تک چلنے والی تھی

شہر چراغاں ، گھر جگمگ ، ہے نور کی بارش چہروں پر
چند دنوں میں روشنی سب کے دل کی بجھنے والی تھی

میرا عقیدہ جانچ کریں گے دین کے سارے آوارے
حق بے چارہ اوندھے منہ تھا، آفت ہونے والی تھی

کاروبار ابھی جاری تھا ، منصوبے کچھ باقی تھے
اور اِدھر تو جسم کی پوری بستی اُجڑنے والی تھی

جی تو بہت پچھتایا، میں نے کیوں نہیں بیچا اپنا ضمیر؟!
حالانکہ ارشدؔ بھاری رقم تھی مجھ کو جو ملنے والی تھی



وہ اتنی دور تھا کہ بس خیال بن کے رہ گیا
مرا تمام جوش سَر وَبال بن کے رہ گیا

مجھے اداس دیکھ کر تو زندگی بھی رو پڑی
میں اپنی موت کے لئے سوال بن کے رہ گیا

کسی طرح کٹے تو پھر تمھارے پاس آؤں بھی
میں اپنے ارد گرد ایک جال بن کے رہ گیا

یہ بے بسی، یہ الجھنیں، یہ میرے سچ کا فیض ہے
میں بعد والوں کے لئے مثال بن کے رہ گیا

جو پیرہن عروج کا پہن کر ارشدؔ آیا تھا
وہ دوپہر میں پیکرِ زوال بن کے رہ گیا



امیر شہر سے میری شکایت ہونے والی ہے
جیالوں کی نظر میں اور عزت ہونے والی ہے

وہی دورِ یزیدی ہے ، وہی ہے کربلائی رنگ
حسین وقت کی پھر سے شہادت ہونے والی ہے

پرخچے اڑنے ہی والے ہیں میری نیکنامی کے
مرے احباب کی مجھ پر عنایت ہونے والی ہے

مجھے ان کی خوشی کا ایک کونا مل گیا ہوتا
تو پھر کیا ہے ، اگر تقسیم جنت ہونے والی ہے

میں اپنا گھر سجاتا ہوں تباہی کے لئے ارشدؔ
خبر ہے اُن کے آنے کی ، قیامت ہونے والی ہے



مجھ کو کسی شمار میں گردانتے نہیں
میری کوئی دلیل بھی وہ مانتے نہیں

سب کو پتہ ہے حال مرا، بس یہ بغض ہے
مشکوک کہنے والے مجھے جانتے نہیں ؟!

رہتا تو ہے ضرور ہمارے ہی درمیاں
یہ اور بات ، ہم اُسے پہچانتے نہیں

دیکھیں وہ رنگ روپ مرا ، گفتگو سنیں
مانا کہ خاندان ابھی جانتے نہیں

بے گھر رہیں کہ فاقہ کریں۔ اپنی شان ہے
ہم دربدر کی خاک کبھی چھانتے نہیں

عادی ہیں غم کی دھوپ کے ارشدؔ اِسی لئے
چادر خوشی کی سر پہ کبھی تانتے نہیں



دو گھڑی بیٹھ کے ویرانے میں گھر بھول گیا
دل کو چین آیا تو جینے کا ہنر بھول گیا

وہ ٹھہرتا ہی نہ تھا میرے دھڑکتے دل میں
میں نے یاد اُس کو بہت رکھا ، مگر بھول گیا

یہ نہ سمجھو کہ میں غافل ہوں ابھی تک تم سے
دردِ دنیا میں ذرا دردِ جگر بھول گیا

میں امیدوں کو سجانے میں لگا تھا اور وہ
ڈال کر مجھ پہ توجہ کی نظر بھول گیا

پھر کبھی یاد نہ ماضی کی ستائے گی مجھے
اُس کو پانے کے لئے خود کو اگر بھول گیا

ہوشمندوں کو بھلا یاد تھا سچ کا انجام
وہ قلندر تھا جو بازار میں سر بھول گیا

کتنا مصروف تھا پردیس میں ارشدؔ مت پوچھ!
میں وطن لوٹ چلا ، زحمتِ سفر بھول گیا



میرے گھر میں ان کے ماتھے کا اجالا ہو گیا
چاند بجھتا ہی گیا ، آخر سویرا ہو گیا

ان کا آنا تھا کہ چہرے پر چمک سی آ گئی
ایسا لگتا ہے کہ اب بیمار اچھا ہو گیا

یا تو باہر ہی رہیں یا جھک کر آنا ہو تو آئیں
آپ کا قد میرے دروازے سے اونچا ہو گیا

پیاس کی شدت سے آخر خون وہ پینے لگا
پانی مہنگا ہو گیا اور خون سستا ہو گیا

مجھ کو اپنی روشنی پر تھا نہایت اعتماد
تم گئے تو میرے اندر گھپ اندھیرا ہو گیا

میں نے گھبرا کر پکارا تھا خدا کی ذات کو
دہریے کہتے ہیں : ارشدؔ بدعقیدہ ہو گیا



بہت دیکھا ، بہت سمجھا ، مگر تجھ سا نہیں پایا
تجھے دل میں بسانے کے سوا رستہ نہیں پایا

کہیں ایسا نہ ہو سو جائیں میرے حوصلے سارے
کوئی الجھن نہیں دیکھی ، کوئی صدمہ نہیں پایا

نکل آیا غلط رستے پہ ایسا تو نہیں شاید
ابھی تک دوستوں سے میں نے کچھ خطرہ نہیں پایا

دکھوں کی چلچلاتی دھوپ میں دل سبز رہتا ہے
کبھی میں نے بھی اتنی عمر میں سایہ نہیں پایا

یہ سارا باغ میں نے اپنے ہاتھوں سے لگایا تھا
وہ آئی ظلم کی آندھی کہ اک پتہ نہیں پایا

ہزاروں چاہنے والوں کا جمگھٹ تھا جنازے پر
مگر میں نے تو ارشدؔ کو کبھی ایسا نہیں پایا



آج کل مجھ پر وہ پھر سے مہرباں ہونے لگا
خون میرا درد بن کر رائیگاں ہونے لگا

چاہیئے تھا بات کی تہہ تک اتر کر دیکھنا
کچھ کسی نے کہہ دیا بس بدگماں ہونے لگا

زندگی کا ایک اک ذرہ فنا ہوجائے گا
آگ کے مانند وہ چہرہ دھواں ہونے لگا

دوست سب میرے مخالف ہورہے ہیں آج کل
یعنی میں کچھ اُن سے آگے کامراں ہونے لگا

سچ اگلنے پر زباں کٹتی ہے آخر کیا کروں
جھوٹ کے اس راج میں میں بے زباں ہونے لگا

کون سا میں معتبر تھا ، میں کہاں مشہور تھا
کیوں خلاف ارشدؔ کے آخر آسماں ہوں لگا



اُن کے ہونٹوں سے وہ محفوظ اجالا نکلا
منہ چھپائے ہوئے کمرے سے اندھیرا نکلا

خوشنما چہرے کے پردے میں تھی زخمی تصویر
میں نے کیا کیا اُسے سمجھا تھا وہ کیسا نکلا

ہائے صیاد نے پر کاٹ دیئے تھے اس کے
یوں نکلنے کو تو پنجرے سے پرندہ نکلا

لوگ پلکوں سے اٹھاتے ہیں وہاں کی مٹی
ہم جسے خاک سمجھتے تھے ، وہ سونا نکلا

اس کے جانے سے میں سمجھا کہ مرا حسن تھا وہ
جیسے چاندی کی انگوٹھی سے نگینہ نکلا

دیکھ کر خوش تھے سبھی گرتے مکاں کا منظر
میری تقدیر کہ ملبے سے دفینہ نکلا

آج میں ان کی گلی چھوڑ کر آیا ارشدؔ
لوگ کہتے ہیں کہ گردش سے ستارا نکلا



یہ کائنات ہے خدا کی یا کھلی کتاب ہے
سوال جو ہوا نہیں ، اُسی کا یہ جواب ہے

میں شاندار جنتوں میں رہ رہا ہوں دوستو!
مگر یہاں بڑی تڑپ ہے، زندگی عذاب ہے

میں اُس کی مجلسوں میں بیٹھ بیٹھ کر بہک گیا
چلو! چلوں میں میکدے کہ وعظ بھی شراب ہے

میں اک ذرا ٹھہر گیا ، پلٹ کے دیکھنے لگا
جو ماضی تھا وہ حال ہے، خراب ہی خراب ہے

تمام شہر نفرتوں کی آگ میں جھلس اٹھا
فقیہ شہر قتل ہو ، یہ خیر ہے ، ثواب ہے

یہ کائنات آئینہ ہے ارشدؔ اُس کے حسن کا
نگاہ ہو تو دیکھئے! وہ کیسا بے حجاب ہے



غم کا اثر زائل ہوا ، کوئی خوشی باقی نہیں
میں چلتی پھرتی لاش ہوں ، وہ زندگی باقی نہیں

چہرہ وہی ، باتیں وہی ، پوشاکِ خوش رنگیں وہی
دنیا وہی ، سب کچھ وہی اور آدمی باقی نہیں

باہر گلی کوچے سبھی روشن ہوئے ہیں کس قدر
اندر جو دیکھا جھانک کر ، کچھ روشنی باقی نہیں

خوشیوں کے گھر میں قہقہوں سے گونجتی تھی چھت مری
وہ گھر نہیں ، وہ چھت نہیں ، وہ دوستی باقی نہیں

میں سر پھروں کی انجمن میں آ پھنسا ہوں اِس طرح
غیرت گئی ، عزت گئی میری ، خودی باقی نہیں

جب ہوگیا بے آبرو ارشدؔ بڑے دربار میں
سب خوش ہیں اب ، دل میں کسی کے دشمنی باقی نہیں



بھلا کروں تو بھلا کچھ مرا بھلا ہوگا؟
مجھے امید نہیں ، خیر مشغلہ ہوگا

یہاں بھی بھوک سے رہتے ہیں بچے شب بیدار
سنا ہے ، آج حویلی میں رَت جگا ہوگا

جو دوست بن کے مرے ساتھ ساتھ رہتا ہے
منافقت کے سوا اور اس سے کیا ہوگا

کھڑا ہوا ہے زمانے سے، دھوپ کھاتا ہے
یقین جانو یہی پیڑ بس ہرا ہوگا

قلم نہ پھر مری تصویر پر چلاؤ گے
تمھارے سامنے جس روز آئینہ ہوگا

خوشی کے نعرے تو مل کر سبھی لگاتے ہیں
مصیبتوں میں مرا کون ہمنوا ہوگا؟!

وہ لوگ جو کبھی حق آشنا نہ تھے ارشدؔ
اُنہی سے میرے عقیدے کا فیصلہ ہوگا



غم نے جب سے مرا گھر دیکھا ہے
اپنی اِن آنکھوں کو تر دیکھا ہے

جلوۂ یار ہوا بے پردہ
کچھ نہیں دیکھا مگر دیکھا ہے

اور میں بھول گیا ہوں خود کو
ہاں فقط ایک نظر دیکھا ہے

ہجر کا حال سنائے نہ کوئی
ہم نے بھی وقت سفر دیکھا ہے

کام کرنے کی لگن جانتا ہوں
بات کرنے کا ہنر دیکھا ہے

دوست سب ہوگئے دشمن میرے
تم نے شاید کہ اِدھر دیکھا ہے

مفلسی پر جو مری ہنستے تھے
آج اُنھیں دست نگر دیکھا ہے

ڈھلتی چھاؤں ہے یہ دنیا جیسے
تونے اے دوست! شجر دیکھا ہے؟

دل میں ممکن ہے کہ ہو آگ بھری
ہم نے پتھر میں شرر دیکھا ہے

کیا ہوا وقت کے فرعون تجھے
آج جو سجدے میں سر دیکھا ہے

یہ وہی ارشدؔ خوش پوش ہے نا!
اب اُسے خاک بسر دیکھا ہے



موسم بہار کا ہے ، لو زنجیر کھل گئی
تم مجھ سے کیا ملے مری تقدیر کھل گئی

ماتھے کی اِن لکیروں نے دھوکا دیا مجھے
دل میں چھپی ہوئی تھی جو تحریر، کھل گئی

یہ موت زندگی کی حقیقت کی شرح ہے
پردہ گرا تو سامنے تصویر کھل گئی

کچھ ایسا اتفاق بھی ارشدؔ کبھی کبھی
آنکھیں کھلیں تو خواب کی تعبیر کھل گئی